مرتّب : ارشد خالد

سلگتے خواب۔ عمرِ گریزاں۔ محبت کے پھول۔ دعائے دل۔ درد سمندر
روشنی کی بشارت۔ قصے کہانیاں۔ میری محبتیں۔ کھٹی میٹھی یادیں
سوئے حجاز۔ فاصلے، قربتیں   منظر اور پس منظر۔ انٹرویوز
غزلیں، نظمیں، ماہیے   عمرِ لا حاصل کا حاصل

ماہیے کی تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری۔ اردو ماہیے کی تحریک۔ اردو ماہیے کے بانی

ادبی کتابی سلسلہ

کتاب نمبر ۴

اشاعتِ خاص

حیدر قریشی نمبر

مرتب

ارشد خالد

معاونین

اکرام الحق سرشار ۔ خالد ندیم ۔ صدیق لاٹکی

رابطہ کے لئے:

مکتبہ عکاس

مکان نمبر 1164، گلی نمبر 2، بلاک سی

نیشنل پولیس فاؤنڈیشن سیکٹر O-9 اسلام آباد

نام کتاب:	عکاس کتاب نمبر۴
مرتب:	ارشد خالد
تاریخ اشاعت:	یکم اکتوبر ۲۰۰۵ء
سرورق:	خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)
مطبع:	ایس ایم اشتیاق پرنٹرز۔لاہور

قیمت: ۳۰ روپے

ناشر

مکتبہ عکاس

House No 1164 Street No 2 Block C

National Police Foundation ,Sector O-9

Lohi Bhair, Islamabad

ای میل:akkasurdu@hotmail.com

فہرست

شخصی زاویے

ادب کی پرکھ کا سوال

''ادب کی پرکھ کا سوال ایک نجی محفل کی گفتگو سے اٹھا تو ان (وزیر آغا) کے داخلی اضطراب نے ایک نئے سوال کو جنم دیا۔'' ''پچھلے دنوں ایک نجی محفل میں اردو کے ایک بزرگ نقّاد نے کسی تازہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میرے لیے اس کتاب کو پسند کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ یہ تو میرے عقائد ہی کے خلاف ہے۔ اور میں سوچنے لگا کہ ادب کی پرکھ کے سلسلے میں اگر عقیدے کو کسوٹی مقرر کیا جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟'' ('**ڈاکٹر وزیر آغا کی تیکنیک**' مضمون بحوالہ **کتاب شام کا سورج** از **ڈاکٹر انور سدید**۔ ص ۲۶۰)

اپنی بات:

حیدر قریشی سے میری دوستی خانپور کے زمانے سے قائم ہے۔ پھر وہ خانپور سے نکل کر کہیں سے کہیں ہوتے ہوئے جرمنی جا پہنچے اور میں بھی خانپور سے نکل کر کئی شہروں سے ہوتا ہوا راولپنڈی آ پہنچا۔ اگر چہ کوٹ سمابہ میں بھی مجھے بعض بزرگ شاعروں کی رفاقت ملی ہوئی تھی لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے اور خانپور کے بہت سارے دوسرے دوستوں کو صحیح معنوں میں ادب کا ذوق اور شوق حیدر قریشی کی صحبتوں سے ملا تھا۔ جب حیدر قریشی کے بارے میں نذر خلیق کی مرتب کی ہوئی کتاب شائع ہوئی تو مجھے حیدر قریشی پر کچھ کام کرنے کا شوق ہوا تھا۔ اب سعید شباب کی کتاب بھی آ گئی ہے۔ اس سے میرے شوق کو رستہ سجھائی دے گیا۔ ادبی دوستی میں ادب کا ایسا رستہ اختیار کیا جائے جو دوسروں سے کچھ مختلف ہو۔ ''عکاس'' تو میں پہلے ہی وقتاً فوقتاً چھاپ رہا ہوں۔ عکاس کا حیدر قریشی نمبر کسی ادبی رسالے یا ادبی کتابی سلسلے کا پہلا نمبر ہو گا۔ یہ خیال آیا اور بس پھر اس منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ مجھے اس وجہ سے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے جن ادیبوں سے مضامین کے حصول کے لیے رابطہ کیا ان میں سے زیادہ تر نے نہ صرف تعاون کیا بلکہ میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی۔ اس تجربے کے نتیجہ میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ دوسرے اہم شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں بھی اسی معیار، اسی اختصار اور اسی انداز کے خاص نمبر شائع کروں۔

جدید ادب کے خانپور کے زمانے سے حیدر قریشی کا یہ طریقۂ کار رہا تھا کہ وہ کسی مضمون یا افسانے کے آخر میں بچ جانے والی جگہ پر کوئی اقتباس دے دیا کرتے تھے۔ ان پر کتابیں مرتب کرنے والے بعض دوستوں نے بھی اس طریق کار کو اپنایا۔ چنانچہ میں نے بھی اسی طریقے کو اختیار کیا ہے۔ مضامین کے آخیر میں جہاں کچھ جگہ بچ رہی ہے وہاں متعلقہ موضوع سے کسی حد تک میل کرتا ہوا کوئی اقتباس حوالے کے ساتھ دے دیا ہے۔ حیدر قریشی کے بارے میں نذیر فتح پوری اور سنجے گوڈبولے اور پروفیسر نذر خلیق کی مرتب کردہ کتب میں دونوں کتابوں کے مرتبین کی اپنی اپنی ترتیب کے باوجود بعض اقتباسات دونوں کتابوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس عمل سے ان اقتباسات کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے اور ان کی واقعی اہمیت ہے۔ البتہ میں نے زیادہ سے زیادہ کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں کوئی مضمون یا اقتباس تکرار کا احساس نہ دلائے اور جہاں تک ممکن ہے غیر مطبوعہ مضامین کو ہی شامل کیا جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اقتباسات کے انتخاب میں چونکہ عام طور پر چھپے ہوئے مواد سے ہی استفادہ کیا جانا ممکن ہے، اس لیے پہلے والی ساری کتابیں میرے پیشِ نظر رہی ہیں۔ لیکن ان سے اقتباسات کے چناؤ میں اتنی احتیاط ضرور

کی ہے کہ وہ پہلے کسی کتاب میں اقتباس نہ کئے گئے ہوں۔ آخری مرحلے میں مجھے حیدر قریشی کی طرف سے، ان کے نام لکھے گئے افتخار امام صدیقی کا خط ملا ہے، اس کا مختصر سا حصہ بطور اقتباس دے دیا ہے۔

اس نمبر میں شامل مضامین کو ترتیب دیتے وقت میرے پیش نظر محترم مضمون نگاروں کے حفظ مراتب کے مطابق نام اور مقام کی بجائے حیدر قریشی کی ادبی اصناف میں دلچسپی کی ترتیب رہی ہے۔ اگر چہ میری دی ہوئی ترتیب حتمی نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق حیدر قریشی نے جس طرح مختلف اصناف سخن میں دلچسپی لی۔۔۔اسی ترتیب سے ان اصناف پر لکھے جانے والے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ اصناف کی ترتیب کا خیال رکھنے کی وجہ سے کئی معتبر اور زیادہ اہم لکھنے والے نسبتاً بعد میں یا آخر میں نظر آئیں گے۔ یہ صرف اس نمبر کی ترتیبی مجبوری ہے۔ اس کے لیے میں سارے دوستوں سے معذرت خواہ ہوں۔

عکاس کے حیدر قریشی نمبر کی تیاری کے سلسلے میں پروفیسر نذر خلیق صاحب نے ذاتی طور پر بہت تعاون کیا ہے، جس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ اسی طرح جن مضمون نگار دوستوں نے خاص توجہ کے ساتھ تعاون کیا ان کا خاص شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، منشا یاد، احمد ہمیش، اکبر حمیدی، سلطان جمیل نسیم، خاور اعجاز، ناصر نظامی۔۔۔ان سب کا شکریہ کہ ان کے مضامین سے اس نمبر کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام دوستوں کا بھی شکریہ جن کے مضامین اس نمبر میں شامل ہیں۔ ان کا تعاون قابلِ تعریف ہے۔

امید ہے **عکاس** کے **حیدر قریشی نمبر** کو سنجیدہ علمی، ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا اور اس نمبر کی پذیرائی کے نتیجہ میں مجھے دوسرے اہم ادیبوں کے خاص نمبر چھاپنے کا حوصلہ ملے گا۔

ارشد خالد

''عمرِلا حاصل کا حاصل ''نادر، انوکھا اور منفرد تجربہ

''(حیدر قریشی) کی پوری زندگی کا تخلیقی اثاثہ ''عمر لا حاصل کا حاصل'' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں پانچ شعری مجموعے (سلگتے خواب، عمر گریزاں، دعائے دل، درد سمندر اور محبت کے پھول) اور چھ نثری مجموعے (افسانے: روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں۔۔۔انشائیے: فاصلے قربتیں۔۔۔ سفر نامہ: سوئے حجاز۔۔۔خاکے: میری محبتیں اور کھٹی میٹھی یادیں) شامل ہیں جسے اردو ادب کا نادر، انوکھا اور منفرد تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔''

(**ڈاکٹر انور سدید** اقتباس از تبصرہ مطبوعہ **روزنامہ نوائے وقت لاہور** سنڈے میگزین مورخہ 21 اگست 2005ء)

میرزا ادیب

سلگتے خواب

(تاثرات کا یہ مکمل متن کسی کتاب میں شامل نہیں اس لیے اس نمبر میں شامل کیا جا رہا ہے۔ **ارشد خالد**)

حیدر قریشی مجھ سے دُور بھی ہیں اور قریب بھی۔ دُور زمینی فاصلے کے لحاظ سے، اور قریب اس محبت اور خلوص کی بنا پر جو وہ میری ذات کے لئے روا رکھتے ہیں، مگر کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ میرے بہت ہی قریب آجاتے ہیں، یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب میں اُن کی کسی تڑپا دینے والے والی تخلیق کا مطالعہ کرتا ہوں، یہ تخلیق بالعموم شعری صورت میں ہوتی ہے۔ حیدر قریشی نے اپنی ذہانت کا ثبوت کئی صورتوں میں دیا ہے، وہ ایک شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی، اور ان کے علاوہ ایک مدیر بھی۔ مجھے ان کی ساری صلاحیتوں نے متاثر کیا ہے، مگر میں جب معروضی انداز میں ان کا تجزیہ کرتا ہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری نظروں میں ان کی غزل ان کے تخلیقی جوہر کی خصوصی مظہر ہے۔ ان کے بعض غزلیہ شعروں نے مجھے حزن وملال کی کیفیت سے بھی دوچار کیا ہے مگر ایسی کیفیت کے اندر بھی اپنا ایک سرور ہوتا ہے۔ یہ سرور درسرور قسم کی کیفیت سے عبارت ہے۔ اس کی وضاحت نہیں ہوسکتی۔ میں نے حیدر کے جب یہ شعر پڑھے تھے تو میری آنکھیں بے اختیار نم ناک ہوگئی تھیں:

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی　　　کہاں ہے شمس وقمر میں جو نور خاک میں ہے

عشق اور نوکری مل کر دونوں چوس گئے ہیں تجھ کو　　　تُو تو بس اب ایسے ہے جیسے گنے کا پھوگ

دوسرے شعر پر شاید کچھ اہل ذوق ناک بھول چڑھائیں، لیکن میں سمجھتا ہوں حیدر نے نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کے ایک عمومی پہلو کا اظہار دل میں اُتر جانے والے انداز سے کر دیا ہے۔ گنے کا پھوگ ایک ایسی مثال ہے جو میں نے پہلی بار ایک شعر میں دیکھی ہے۔ حیدر کے اور بھی کچھ اشعار ایسے ہیں جن کے متعلق میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انھیں گنگنانے کو بے اختیار جی چاہا اور اکثر گنگناتا رہا:

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدرؔ　　　پھر مرا شوق سفر مجھ کو چرا لایا تھا

خوشی حد سے زیادہ دے کے بھی برباد کرتا ہے　　　انوکھے ہی ستم وہ صاحب ایجاد کرتا ہے

اور یہ شعر تو قیامت کا شعر ہے:

غم تمہارا نہیں جاناں ہمیں دُکھ اپنا ہے　　　تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

آج حیدر قریشی اپنا پہلا شعری مجموعہ دنیائے ادب کو دے رہے ہیں، میں اُن کے اس مجموعے کا خیر مقدم کرنے والوں میں بصد مسرت شامل ہوں!

(۱۹۹۱ء کی تحریر)

ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الٰہ آباد)

حیدر قریشی کی غزلیہ شاعری کے امتیازات

۱۸۵۷ء کے انقلابات کے بعد شعر وادب کی صورتِ حال اور اس کے تقاضے کچھ اس انداز کے ہوئے کہ کچھ بڑوں نے اپنے آپ کو صرف شعر وشاعری تک محدود نہ رکھا اور نثر نگاری، تنقید نگاری، انشائیہ نگاری، صحافت وغیرہ کو بھی زیرِ قلم لا کر ادب کی مقصدیت یا بامقصد ادب کی معنویت کی ایسی بنیاد رکھی کہ جس سے باقاعدہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ حالیؔ، شبلیؔ۔ آزادؔ وغیرہ ایسے اکابرینِ ادب میں سے ہیں جن کی ہمہ جہتی، مختلف شعبہ ہائے ادب میں ان کی غیر معمولی کارکردگی نے ایک تاریخ مرتب کی۔ یہ سلسلے کچھ ایسے قائم ہوئے کہ جدید دور میں علی سردار جعفریؔ، وزیر آغاؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، محمد حسنؔ، شمس الرحمٰن فاروقیؔ، قمر رئیسؔ، شمیم حنفیؔ، رفعت سروشؔ وغیرہ نے نثر، نظم، تخلیق، تنقید، غرضیکہ مختلف اصناف وشعبوں میں نہ صرف اپنی موجودگی درج کی بلکہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اسی سلسلے کی کڑی ہیں حیدرؔ قریشی، جو بنیادی طور پر شاعر ہیں اور عمدہ شاعر ہیں۔ شاعری کی مختلف اصناف پر تو طبع آزمائی کی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھے ہیں، انشائیے اور خاکے بھی، رپورتاژ اور سفرنامے بھی اور تحقیق وتنقید سے بھی رشتہ ہے اور ایک عمدہ ومعیاری رسالہ کے مدیر بھی ہیں۔ اس مصروف دور میں قلم اور ذہن کا اتنی کثیر اصناف میں تقسیم ہونا اور الگ الگ زاویہ سے مسلسل کام کرتے رہنا ایک مشکل ہی نہیں پیچیدہ کام ہے۔ لیکن حیدر قریشی کی غیر معمولی محنت اور صلاحیت ان سب پر بیک وقت طبع آزمائی کرتی رہتی ہے اور تقریباً ہر شعبہ میں اپنا مناسب ومعقول مقام وشناخت بھی رکھتی ہے۔ تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور وہ بھی غزل کے رومانی وعشقیہ شاعر، جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے ؎

خوشی کے لمحے لکھو، عمرِ اضطراب لکھو　　　نکالو وقت کبھی عشق کا حساب لکھو

عشقیہ شاعری بظاہر خوشی کے لمحوں سے سرشار سمجھی جاتی ہے اور اس کا مرکز ومحور جنس وجسم سمجھا جاتا ہے لیکن جو لوگ حقیقی عشق کی معرفت رکھتے ہیں ان کی پوری عمر اضطراب میں ہی گزرتی ہے، ایک صحت منداضطراب۔ اسی لیے ہمارے مقتدر شعراء نے اضطراب، رنج وغم کی بڑی قدر کی ہے اور اسے بڑی نعمت قرار دیا ہے، اس سے نہ صرف غم کی معرفت ہوتی ہے بلکہ حیات وکائنات کا عرفان بھی حاصل ہوتا ہے، نیز

تزکیۂ نفس کا موثر ذریعہ بھی ہاتھ آتا ہے اور نجاتِ دیدہ و دل کا بھی۔ اسی لیے ہمارے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

دل گیا رونقِ حیات گئی   غم گیا ساری کائنات گئی

یہ وہ مشکل منزل ہے جہاں سفلی جذبات اور پاکیزہ تخیّل کے درمیان مسلسل تصادم کی سی کیفیت رہتی ہے، جن فنکاروں نے دونوں کیفیتوں پر قابو پا لیا یعنی عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی باہم شیر و شکر ہو گئے تو عشقیہ شاعری لب و رخسار، بوس و کنار کی حدوں سے نکل کر انسانی آثار و آزار میں ڈوب کر حیات و کائنات کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔ لیکن عشقِ حقیقی یا عشقِ انسانی کی منزل تک پہنچنے کے لیے عشقِ مجازی یا عشقِ جسمانی بھی ضروری ہے، جو لوگ رومانی شاعری کو سرسری طور پر لیتے ہیں وہ اس راز کو سمجھ نہیں پاتے کہ جنس و جسم صرف دو بدن کا نہیں، دو آتماؤں کا اور دو تہذیبوں کا ملن ہوتا ہے۔ جہاں سے بقا و فنا کی منزلیں بھی شروع ہوتی ہیں اور شاعر آفاق کی ان منزلوں تک پہنچنے لگتا ہے جہاں ساری کائنات سے وہ عشق کرنے لگتا ہے اور محبوب محض ایک حوالہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر آپ سلیقہ سے اپنے محبوب سے محبت نہیں کر سکتے تو دنیا سے بھی نہیں کر سکتے، اگر آپ مقامیت کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تو عالمیت کا راز سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے، کیونکہ بڑی شاعری مقامیت سے عالمیت تک کا سفر طے کرنے کا نام ہے۔

حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بڑے مقصد سے دور ہلکی پھلکی رومانی شاعری ہے۔ مثلاً ؎

اب کے جدائیوں میں بھی رنگِ وصال ہے   بے دَم ہوں میں اِدھر تو اُدھر وہ نڈھال ہے

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ وقتی اُبال ہے   اب ماننا پڑا کہ محبت وبال ہے

تمہارا عشق بھی ہم سے ادھورا رہ گیا جاناں   جہاں میں ہم سے حالانکہ یہی اک کام ہونا تھا

تمہارے عشق میں کس کس طرح خراب ہوئے   رہا نہ عالمِ ہجراں، نہ وصل یاب ہوئے

اس نوع کے متعدد اشعار ایک عام قاری کی نظر میں محض عشقیہ رنگ کے معمولی سے اشعار لگ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تہوں میں اتریئے، اس کی کیفیت و معنویت میں داخل ہویئے تو محبت کو وقتی اُبال سمجھنے والے لوگوں کے لیے ایک درس ہے کہ سچا عشق وہ معرکۂ جاں ہے کہ ایک سچا عاشق بھی بہ آسانی اس کے مکمل تقاضے پورے نہیں کر سکتا، حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ جہاں میں اس کا وجود صرف عشق کرنے کے لیے ہی ہے۔ عشق، تصورِ عشق یا معاملاتِ عشق کو سرسری یا ہلکے طور پر لینے والوں کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ اس جہان میں خرابی زیادہ ہے لیکن اس خرابی میں ہی مضمر ہے تعمیر کی دنیا، فکر و خیال کی دنیا۔ اس راستے پر چلتے چلتے سچا عاشق، سچا شاعر ایک ایسی دنیائے لامکان میں داخل ہو جاتا ہے جہاں دنیا، آوازیں، شکست و فتح سب بے معنی سے لگنے لگتی ہیں۔ اب ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

وسعت میں لامکان کی اب کھو چکا ہوں میں   کس نے فصیلِ وقت سے آواز دی مجھے

میں منزلوں کی کھوج میں خود سے بچھڑ گیا   پھر عمر بھر تلاش ہی اپنی رہی مجھے

حقیقتوں کے سرابوں میں کھو چلا ہوں میں   یقیں دلاؤ مجھے بدگمانیوں کی طرح

پھر ایک منزل یہ بھی آتی ہے ؎

اس طرح شہرانا پر میں تباہی مانگوں   اپنے ہونے سے نہ ہونے کی گواہی مانگوں

میں اپنے ہونے کے احساس سے ہراساں ہوں   مِرے شعور میں کچھ کیفِ بے خودی بھر دو

جب منزل ہونے اور نہ ہونے تک پہنچ جائے تو تشکیک کی یہ منزل ہی حقیقتوں کی تلاش جاری رکھتی ہے۔ اور پھر شاعر ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں حقیقت اور غیر حقیقت، وجود و عدم وجود، فنا و بقا کی صورتیں اس کی دنیائے فکر خیال کا فلسفہ بن جاتی ہیں اور گوشت پوست کا معشوق محض ایک ذریعہ اور زاویہ ہوتا ہے، کلیہ نہیں۔ چند اشعار اور دیکھئے ؎

ایک اَن دیکھے کی سوچوں میں گھرا رہتا ہوں میں   اُس کی آنکھیں، اُس کا چہرہ سوچتا رہتا ہوں میں

خواہشوں کی تتلیوں کے ساتھ اُڑتا ہوں مگر   وسوسوں کے سامنے بے دست و پا رہتا ہوں میں

تم نے کبھی زخموں کے نگینے نہیں دیکھے   عشّاق کے دہکے ہوئے سینے نہیں دیکھے

سامنے ہے گھر مگر مفقود گھر کے راستے   کھو گئے آخر کہاں معبود گھر کے راستے

دشتِ حیرت میں کھڑا ہوں چشمِ حیرت وا کیے   ہیں ابھی غائب، ابھی موجود گھر کے راستے

شاعری صرف عشق و محبت کا نام اور عشق و محبت صرف لب و رخسار اور بوس و کنار کا نام نہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ زندگی کی تگ و دو، جدو جہد، دربدری نے حیدر قریشی کو اس بات کا احساس دلا دیا ہے کہ تخلیقی عمل ایک ایسا مقدّس یا با مقصد عمل ہے جس سے صرف اپنی ذات وابستہ نہیں ہوتی بلکہ حیات و کائنات کے در کھولتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ذات صرف حوالہ ہے ورنہ اس میں موسم، چمن، گھر، شہر، اہلِ ستم، کعبہ، صنم وغیرہ سب کچھ ملے گا اور اپنی مکمل انسانی اور سماجی معنویت کے ساتھ اور یہ کیفیت و خصوصیت شاعری کی پہلی ہی منزل پر ہے۔ میں نے ابھی تک ان کے جتنے بھی اشعار پیش کیے ہیں وہ ان کے پہلے شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' سے ہیں۔ ''عمرِ گریزاں'' سے لے کر بعد کا سفر ظاہر ہے کہ سنجیدگی اور پختگی کے اعتبار سے آگے کا سفر ہے، جہاں ان کی تہہ داری، فکر انگیزی اور معنی آفرینی کی ترقی یافتہ صورتیں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ بعد کے دور میں حیدر قریشی نے عشقیہ شاعری ترک کر کے محض فلسفیانہ شاعری ہی کی ہو۔ عشق کی آگ اور اس کا جنون اپنے رنگ ضرور بدلتا ہے لیکن تا دمِ حیات پیچھا نہیں چھوڑتا، اور عشق کا درد جیسے جیسے بڑھتا ہے دردمندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ؎

درد جتنا بھی ترے در سے عطا ہوتا گیا
کاسۂ دل دردمندوں کا دعا ہوتا گیا

پھر مری شہ رگ سے بھی آتا گیا نزدیک تر
مجھ سے کیا بچھڑا ہے وہ گویا خدا ہوتا گیا

گونج اُٹھیں گنبدِ جاں میں مری تنہائیاں
کوئی خط خاموش لفظوں سے صدا ہوتا گیا

جس قدر ہوتا گیا اُس کی محبت کا اسیر
ذات کے زندان سے حیدرؔ رہا ہوتا گیا

ایک طرف محبت کے حوالے سے ذات کے زنداں سے رہا ہونا دوسری طرف گنبدِ جاں کی تنہائیوں کا گونجنا اور پھر محبوب کا خدا ہو جانا اور وہ بھی ہجر کی صورتوں میں۔ یہ عشق کی ایسی منزل ہے جو طویل ریاضت، عبادت، جنون اور حکمت کے بعد آتی ہے۔ جہاں دنیا پہلے تو آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے اس کے بعد روح میں اُتر جاتی ہے۔ محبت اور محبوب کی حقیقت سب کچھ وسعت پا کر کونین پر چھا جاتی ہے۔ یہ غزل دیکھیے۔

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے
اب نکلتا ہی نہیں رُوح کی گہرائی سے

اہلِ دنیا بھلا اِس رَمز کو کیسے سمجھیں
عشق رُسوا نہیں ہوتا کبھی رُسوائی سے

جسم بھی اپنی جگہ زندہ حقیقت ہیں مگر
دل نہیں ملتے فقط جسموں کی یکجائی سے

مرحلے آئے تھے خوف اور گنہ کے پہلے
روشنی گیان کی پھر پھُوٹی تھی تنہائی سے

بے لحاظی کا کسے دُکھ نہیں ہوتا حیدرؔ
ہم نے شکوہ نہ کیا پر کسی ہرجائی سے

اس منزل پر پہنچتے پہنچتے فکر کی بلندی، خیال کی نزاکت، غزل کے اسرار و رموز حیدر قریشی کی غزل گوئی کے وہ امتیازی اوصاف بن جاتے ہیں جہاں حقیقت اور رومانیت، کلاسیکیت اور جدیدیت، مقامیت اور عالمیت اور ان سب پر غالب ایک مخصوص شاعرانہ کیفیت نے ان غزلوں کو لائقِ مطالعہ ہی نہیں بلکہ عہدِ حاضر کا ایک رزمیہ بنا دیا ہے۔ جس کا پُر شوق مطالعہ ایک نئی جمالیاتی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جہاں زمان و مکاں ماضی و حال باہم مدغم ہو کر غزلیہ شاعری کی ایک ایسی لے اور ایک ایسا آہنگ بن جاتے ہیں جہاں شاعری صرف ادب ہی نہیں بلکہ فکر و فلسفہ، تاریخ و تہذیب کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں جن کی معنویت و مقصدیت کا دائرہ پھیل کر قوسِ قزح کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک آفاقی معنویت کا علمبردار۔ چند اشعار اس لب و لہجہ کے ملاحظہ کیجیے۔

عشق کی دنیا کے اَن دیکھے نگر رہتے ہیں
عمر تھوڑی سی ہے اور اتنے سفر رہتے ہیں

جو دل میں کشمکشِ نیک اور بد نہ رہے
لہو کی لہروں میں پھر کوئی جزر و مد نہ رہے

یہی تذبذب و تشکیک اب سند ٹھہرے
سند سمجھتے تھے جن کو وہ مستند نہ رہے

درد و غم سے اسے نکھارتا ہے
عشق انسان کو سنوارتا ہے

انتہائے تیرگی سے ہو گیا سورج طلوع
پیاس اتنی بڑھ گئی کہ خود سمندر ہو گئی

کھوج رہے تھے روح کو جسموں کے رستے سے
طور طریقے پاگلوں والے کر رکھے تھے

جو بس میں ہے وہ کر جانا ضروری ہو گیا ہے
تری چاہت میں مر جانا ضروری ہو گیا ہے

کبھی میر تقی میرؔ نے کہا تھا۔ عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

عشق اور جنون کی یہی وہ منزل ہے جہاں شاعر سود و زیاں سے بہت اُوپر اُٹھ کر عالمِ دیوانگی میں کشف و وجد کی ایسی منزل پر آ کھڑا ہوتا ہے جہاں سب کچھ حقیر سا لگنے لگتا ہے اور حیات و کائنات سے متعلق بہت سارے سوالات اپنے آپ جنم لینے لگتے ہیں۔ بڑی شاعری اکثر سوالات ہی قائم کرتی ہے۔ دیوانِ غالبؔ کا پہلا مصرعہ ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا''۔۔۔اقبالؔ نے بھی کہا تھا: ''زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے'' شاعری جب ایسے فلسفیانہ سوالات میں گم ہوتی ہے تو پیغمبری کے راستے پر چلنے لگتی ہے اور ہر برا سنجیدہ شاعر سوالات ہی قائم کرنے لگتا ہے اور ان سوالوں کے ذریعہ دنیا اور انسانوں کو سمجھنے و سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ہماری شاعری کی ایسی سنجیدہ اور بڑی روایت ہے جو ہر شاعر کے حصہ میں نہیں آتی ہے جب تک کہ پوری سنجیدگی اور سپردگی کے ساتھ دنیا سے رشتے نہ جوڑے جائیں فکر و فن کے معیاری آداب نہ سمجھ لیے جائیں۔

خوشی کی بات ہے کہ حیدر قریشی کی شاعری میں ایسے سوالات کثرت سے کبھی بالائی سطح پر اور کبھی زیریں سطح پر دکھائی دیتے ہیں جس سے غزل کا مزاج و مذاق سنجیدہ و معیاری ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں صورتوں میں غزل کی زبان اور اس کے اسلوب پر بھی قدرت ہو تو رمزیت و اشاریت، جمال و جلال، سوال کا اٹوٹ حصہ بن کر شاعرانہ اقدار اور انسانی افکار کی لازوال صورتوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور پھر مشقِ سخن اور فکرِ مسلسل کا امتزاجی و انجذابی رویہ ایک ایسی وحدت میں ڈھل جاتا ہے جہاں حرف و لفظ کا اسلوب بھی شاعر کے فکری لب و لہجہ میں ڈھل کر ایک ایسی راہ اختیار کر لیتا ہے، جس کی منزلِ مقصود پیغمبری کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں اب حیدر قریشی کی دو غزلوں کے چند اشعار پیش کر کے اپنی بات اختتام تک پہنچاتا ہوں۔ ایک غزل وہ ہے جہاں اس نوع کے سوالات ہیں۔

عروج کیا ہے، زوال کیا ہے
خوشی ہے کیا اور ملال کیا ہے

یہ گردشِ ماہ و سال کیا ہے
زمانے! تیری یہ چال کیا ہے

ہوس تو بے شک ہوس ہی ٹھہری
یہ جستجوئے وصال کیا ہے

ہے دل کوئی بے کنار صحرا
کہ آرزوؤں کا جال، کیا ہے

حقیقتیں تو فریب نکلیں   جہانِ خواب و خیال کیا ہے
خدا ہے مشکل کشا تو حیدؔر   کوئی بھی کارِ محال کیا ہے

اس غزل میں صرف سوالات نہیں ہیں بلکہ کائنات کے وہ آثار و آزار ہیں جن سے ایک سنجیدہ شاعر ہمہ وقت دست و گریباں رہتا ہے۔ کرب و انتشار میں مبتلا رہتا ہے۔ اب یہ اس کا کمالِ فکر و فن ہے کہ انتشار کو انبساط اور کرب کو حظ میں تبدیل کر کے اسے ایک ایسی منزل پر لا کھڑا کرے جس سے امید و نشاط کی کرن پھوٹ پڑے۔ بڑی اور با مقصد شاعری کا یہی کمال ہوا کرتا ہے۔ حیدر قریشی کا کشف و وجد، علم و ہنر اور ان کا شاعرانہ کمال اسی منزل پر آ پہنچا ہے جہاں وہ کہنے پر مجبور ہیں۔

اندر کی دنیائیں مِلا کے ایک نگر ہو جائیں   یا پھر آؤ مل کر ٹوٹیں اور کھنڈر ہو جائیں
ایک نماز پڑھیں یوں دونوں اور دعایوں مانگیں   یا سجدے سے سر نہ اٹھیں یا لفظ اثر ہو جائیں
خیر اور شر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں   بھول اور توبہ کرتے سارے سانس بسر ہو جائیں
ہم ازلی آوارہ جن کا گھر ہی نہیں ہے کوئی   لیکن جن رستوں سے گزریں رستے گھر ہو جائیں
ایک گنہ جو فانی کر کے چھوڑ گیا دھرتی پر   وہی گنہ دوبارہ کرلیں اور اَمر ہو جائیں
صوفی، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں   خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

زندگی کے شب و روز، جدو جہد، در بدری، مادی آسودگی کی کھوکھلی صورتیں بظاہر عمر کو لا حاصل بنا دیتی ہیں لیکن فن اور فنکار اسی سلسلۂ لا حاصل میں منزلِ حاصل تلاش کرتا رہتا ہے۔ حیدر قریشی کا یہ سفرِ مسلسل اور یہ شعری سرمایہ عمرِ گریزاں کی تگ و دو اور غم شناسی کا یہ عمل شعر و سخن کی ایک ایسی دنیا میں لا کھڑا کرتا ہے جہاں افکار و اقدار ہی حقیقت ہیں باقی سب خواب، ایک ہیولیٰ، ایک دھند۔ اچھی بات یہ ہے کہ حیدر قریشی امکان اور عرفان کی اس منزل پر آ گئے ہیں جہاں سے بڑی شاعری اپنے راستے ہموار کرتی ہے۔ کسی عمدہ شاعری میں بڑی شاعری کے امکانات پیدا ہونے لگیں اور اس کے درِ فکر و معنی وا ہونے لگیں، اس میں گہری معنویت اور امکانی وسعت پیدا ہونے لگے تو پھر راستے خود بخود ہموار ہونے لگتے ہیں۔ یہ کم بڑی بات نہیں۔ دیارِ غیر اور ایک غیر ادبی ماحول میں جس طرح وہ شعر و سخن، ادب و تہذیب سے جذباتی و فکری انداز سے وابستہ ہیں اور جس سچی لگن، محبت و محنت سے سعیِ مسلسل میں مصروف و مشغول ہیں، یقین ہے کہ حیات و کائنات کا عرفان و ادراک انہیں ایک ایسی منزل پر لا کھڑا کرے گا جہاں منزل خود انہیں آواز دے گی۔ تب ان کے خوابوں کو حقیقت کی ایسی تعبیر مل جائے گی جو انسانیت کی تقدیر بن جائے گی۔ ایک ایسا نروان جو آدمی کو مکمل انسان بنانے کے لیے کافی ہوا کرتا ہے۔☆☆

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدؔر   پھر مِرا شوقِ سفر مجھ کو چُرا لایا تھا

نسرین نقاش (سری نگر)

حیدر قریشی کی تازہ غزلیں

حیدر قریشی عصر حاضر کے نہایت اہم فنکار اور پختہ گو شاعر ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعوں کے مجموعہ ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کی اشاعت کے بعد بھی ان کی شاعری رواں دواں ہے۔ آپ ایسے جہاندیدہ شاعر ہیں جنہوں نے دنیا کے گرم و سرد کو بھگتا ہے۔ ذاتی تجربات و مشاہدات کا ایک سرمایہ ان کے پاس ہے جو ان کے فن کو جلا بخشتا ہے۔ ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کی اشاعت کے بعد سے اب تک ان کی جو غزلیں میرے مطالعہ میں آئی ہیں۔ اس وقت ان کے حوالے سے کچھ بات کروں گی۔

دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم   سو اب اس کے عشق میں گھلنے والے ہیں
وصل کی شب تھی اور اجالے کر رکھے تھے   جسم و جاں سب اس کے حوالے کر رکھے تھے
ہوس تو بے شک ہوس ہی ٹھہری   پہ جستجوئے وصال کیا ہے
طے ہو گیا اک وصل سفر اور مکمل   یہ چوٹی بھی اب ہو گئی سَر اور مکمل
ایک خوشخط سے شخص نے حیدؔر   ہم کو بھی خوش خیال کر ڈالا

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے گفتگو کرنا ہے۔ حیدر قریشی شاعری کی اس بنیادی صفت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ حسن و عشق کے آپسی معاملات، وصل و فراق، وفا و جفا، بدگمانیاں اور دل شکنیاں جو ہر عاشق کا مقدر ہیں، ان سے خود بھی ہمکنار ہیں، اسی لیے اپنے جذبات و احساسات میں حقیقت کے رنگ بھر دیتے ہیں۔

اندر کی جانب اور بھی اندر سفر کیا شروع   ازلی مسافروں کو جب اس نے قیام لکھ دیا
معافی مانگنا پھر بعد میں خلوص کے ساتھ   گناہ کرنا خشوع و خضوع سے پہلے
کون انگڑائی سی لیتا ہے نفس کے اندر   لذتِ وصل مہکتی ہے ہوس کے اندر
واقفیت ہے ان سے اپنی برسوں کی   دکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں

آخر الذکر شعر میں دکھ علامت سے بڑھ کر خود ایک کردار کی صورت میں عالمِ وجود میں آ گیا ہے۔

حیدر قریشی کی زبان سادہ، لہجہ فطری اور اظہار بیان پُر سلیقہ ہے۔ اُن کے یہاں جو اُن کی فکر میں بلندی و بالیدگی اور جذبے میں شدت پائی جاتی ہے وہ ان کی شاعری میں فکر و جذبے کا ایک خوبصورت سنگم بن جاتا ہے۔ وہ نفس مضمون کو شعری پیکر میں ڈھالتے وقت علامات و استعارات اور تشبیہات کا استعمال

کرتے ہیں۔وہ معنویت اور اشاریت کو بروئے کار لاکر اپنے شعروں میں چمک پیدا کر دیتے ہیں۔

تم نے وہ منظر ہی کب دیکھے ہیں، جب درد سمندر، دل دریا میں گرتے ہیں
درختوں پر پرندے لَوٹ آنا چاہتے ہیں خزاں رُت کا گزر جانا ضروری ہوگیا ہے
سیاہِ شب نے تو اندھیر کر دیا تھا بہت سو آ گیا ہوں میں وقتِ طلوع سے پہلے
یہ عید آئی ہے کس قتل گاہ میں حیدرؔ سلام پھیر لیا ہے رکوع سے پہلے
آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری حیدر میل دلوں کے دھلنے والے ہیں

اسرارِ کائنات اور فطرت کے تقاضے کئی مقامات پر انسان کو حیران و ہراساں کرتے رہتے ہیں۔زندگی کیا ہے؟، موت کیا ہے؟ گردشِ وقت اور قسمت کیا ہیں؟ اس قسم کے بے شمار سوالات انسان کو مضطرب کرتے رہتے ہیں۔ایک شاعر اور سوچنے والا ذہن رکھنے والا ایسے اہم سوالات کو کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے۔حیدر قریشی بھی ایسے سوالات سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

عروج کیا ہے، زوال کیا ہے خوشی ہے کیا اور ملال کیا ہے
یہ گردشِ ماہ و سال کیا ہے زمانے! تیری یہ چال کیا ہے
سوال جو اتنے کر رہے ہو تمہارا اصلی سوال کیا ہے

حیدر قریشی کے یہاں یک رُخی شاعری کی حد قایم نہیں ہوتی، انسانی زندگی سے وابستہ لگ بھگ سبھی مسائل ان کی شاعری میں موجود ہیں۔آفاقی قدروں کا حامل یہ شاندار فنکار اور دردمند شاعر کسی بانکے شہسوار کی طرح میدان شعر و ادب میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔شعری تخلیق کی نئی نئی منزلیں اس کا مقدر بنتی جا رہی ہیں۔

نئے زخموں کا حق بنتا ہے اب اِس دل پہ حیدرؔ پُرانے زخم بھر جانا ضروری ہوگیا ہے
کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر
اک روح کہ سونا ہے مگر مَیل بھری بھی اک آگ اسی مَیل کو دھونے کے لئے ہے
آنکھوں میں ابھی دھول سی لمحوں کی جمی ہے دل میں کوئی سیلاب سا رونے کے لئے ہے
بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدرؔ کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اس پر دَم کرتے

☆☆

''آپ کی غزلوں کا معیار اتنا اچھا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اگر اہلِ وطن نے چند روز کے لئے بھی اپنے تعصّبات کو سلا دیا تو وہ ان کی تعریف کرنے پر خود کو مجبور پائیں گے'' (مکتوب **ڈاکٹر وزیر آغا** بنام حیدر قریشی۔تحریر کردہ ۲۸ رمئی ۱۹۹۱ء بحوالہ **حیدر قریشی کی ادبی خدمات** ص ۴۰۔۴۱)

احمد ہمیش (کراچی)

حیدر قریشی کی نظمیں

حیدر قریشی جس جرمنی میں رہتے ہیں، وہیں کا ایک بڑا شاعر (۱) ہولڈرلن ہوا کرتا تھا۔ہولڈرلن نے ایک موقع پر کچھ یوں کہا تھا کہ شاعر آسمانی بجلی سے جل جاتا ہے یا آسمانی بجلی شاعر کو جلا دیتی ہے۔بات تو ایک ہی ہے مگر اس میں مضمر رمز خالص جذبی و حسی ہے۔جس کسی نے طوفانی بارش کے دوران گرج چمک اور کڑک کے ساتھ آسمانی بجلی کو زمین پر گرتے بلکہ کسی پیڑ پر گر کے اُسے خاکستر کرتے دیکھا ہو وہ آسمانی بجلی اور پیڑ کی مطابقت سے شاعری اور شاعر کے درمیان تعلق کی صداقت کا تصور کرتا ہے۔

ہر چند کہ حیدر قریشی نے صنفِ شاعری کی ہر فارم خاص طور پر غزل، نظم اور ماہیے میں اپنی علیحدہ پہچان بنائی۔تاہم اُن کے پانچ شعری مجموعوں میں سے تین مجموعوں ''عمر گریزاں''، ''دعائے دل'' اور ''درد سمندر'' میں نظمیں شامل ہیں اور ان مجموعوں میں سے منتخب کی گئی نظمیں قاری کو متوجہ کرتی ہیں۔

حیدر قریشی پاکستان سے جرمنی کن حالات میں گئے !وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔تاہم ان کی نظموں پر ایک نظر کرتے ہوئے کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اُن کی عمر کا کون کون سا حصہ گریزاں تھا! یا کہیں اُن کی اب تک کی گریزاں عمر ایک سرے سے ہی گریزاں ہو، درمیان میں کہیں کچھ چھوٹ گیا ہو یا جگہ بھرنے کے لئے خالی رہ گیا ہو! اس سب کے پیش نظر آسانی سے کوئی ورڈکٹ (Vardict) نہیں دیا جا سکتا۔یہ ضرور ہے کہ انہوں نے ''عمرِ گریزاں کی نظمیں'' کے عنوان سے جو نظمیں خلق کیں، اُنہیں اُن کے اسلوبِ شعری اور کیفیتِ نزول کی اساس پہ موضوع کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر نظموں میں سے پہلے شروع کی تین نظموں ''خطا''، ''درد'' اور ''ایک اداس کہانی'' کو ایک معنوی لڑی (SPECTRUM) میں موضوع کیا جائے تو تصویری وحدت ''ایک اداس کہانی'' میں مرکوز ہوتی ہے، اس طرح کہ جو دُھند عمرِ گریزاں کی یادوں سے ترکیب ہو کے آنکھوں کے چار سو پھیلی ہے وہ نظم ''خطا'' میں مذکور دل اور آنکھوں میں بسنے والے حسن سے بچھڑ کے عاشق کے مقدر کے خلاف بنے ہوئے سفاک سناٹے سے منسلک ہے۔جب کہ نظم ''درد'' میں شاعر کے تصورِ عشق کی توثیق درد کے رشتوں سے

(۱) ''ڈیزائن'' کے فلسفہ کا محرک جرمن فلسفی ہیڈیگر ہولڈرلن کی شاعری کا بہت دلدادہ تھا۔

ہوتی ہےاوران سب کے معنیٰ نظم ''اداس کہانی''میں حسرتِ ناتمام کے موڑ پہ کچھ یوں واضح ہوتے ہیں:

مگر کانوں میں سارے منظروں کی
مدھر بھری جھنکاراور چہکار کی صورت
رگِ جاں تک اُترتی ہے،لہو میں بولتی ہے
روح میں رس گھول دیتی ہے
مگر دل میں نہیں آتی
کہ دل کے دیس میں آنے کے سارے راستے
آنکھوں سے آتے ہیں

مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حیدر قریشی کے دل کا دیس بہت دور بساطِ نظر سے اوجھل ہے جس کی صورتِ حال اس حد تک مختلف ہے کہ نظم ''پھاگن کی سفاک ہوا'' تک آتے آتے آسمانی بجلی پیڑ پر گر چکی ہے، یہ پیڑ ہی تو شاعر کا وجود ہے۔معلوم یہ ہوا کہ شاعری آسمانی بجلی ہےاور شاعر کا وجود پیڑ ہے۔تاہم پیڑ کا خاکستر ہونا تخلیقی وجود کا جواز ہے اور اس سے منسلک ہے درد کے رشتے: بیوی،شعیب ،عثمان ،ٹیپو، مانو،رضوانہ...... یہ رشتے شاعر کے گم شدہ بچپن کے رشتے ہیں لیکن گم شدہ بچپن کی یادوں کے حوالہ سے درد کے رشتوں کو اسم دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔جمالیاتی نظام میں کھوئے ہوئے رشتوں کی بھی بازیافت ہوتی ہے۔مثلاً ''تمہارے لئے ایک نظم'' کی ان سطروں پر ایک نظر کیجئے:

طلسمِ حرف کے جو اسم بھی ہیں
سب تمہاری آنکھ کے جادو میں بستے ہیں
مرے مفہوم اور معنی تمہاری روح میں پنہاں
تمہیں پانے کی خواہش
صرف خواہش ہی نہیں جاناں!
مجھے اپنے ادھورے پن کی تکمیل کرنی ہے

اس ادھورے پن کی تکمیل کے لئے ''جاناں'' سے مخاطب ہوتے ہوئے طلسمِ حرف کے اسرار سکھانے اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کے نزدیک آنے کے لئے اظہارِ تمنا کے باوٴجود عمرِ گریزاں حائل نظر آتی ہے۔''چاند کی تسخیر کے بعد''،''میں آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا''،''نصف سلور جوبلی''،''صدا کا سمندر''،فاصلوں میں ملاپ،''منی پلانٹ''،''محبت کا خدا''،''حاصلِ زندگی''،''بہار کے بھلے دن''،''عجیب دشمن''،''دعائے دل''،''بے فیض موسم کا دکھ''،''ایک درواڑ کا پیغام''،''ہوا''،''دعا

گزیدہ''،قیامت''،''ایک خواہش کی موت''،''سرسوں کا کھیت''اور''تخلیق در تخلیق''میں حیدر قریشی کے دل کے دیس سے فاصلہ حائل کا کرب محسوس ہوتا ہے۔البتہ''دعائے دل'' کی نظمیں کے عنوان سے کچھ متفرق نظمیں''نئی شالاط''اور''دعا''بلکہ درد سمندر کی نظمیں کے عنوان سے''چلو ایک نظم لکھتے ہیں''اور محبت کا ایک یادگار دن''میں حیدر قریشی کا تصورِ حسن صدیوں کی کہانیوں کو سمیٹے ہوئے ہے:

وہ شہد اور زہر میں گوندھے ہوئے
سوئے ہوئے سارے زمانے جاگ اٹھے ہیں
ہماری داستاں تو داستاں در داستاں کا سلسلہ ہے

جب کہ''درد سمندر'' کی منفرد ترکیب حیدر قریشی کے شعری اسلوب کی مہرِ استناد ثبت کرتی ہے۔کون نہیں جانتا کہ اپنی جنم جات مٹی یا اپنے جنم جات دیس کو چھوڑ کے غیر ملکوں کا رُخ کرنے والوں کو معاشیات لے جاتی ہے۔مگر حیدر قریشی کے شعری نظام سے تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ اپنی روح تو اپنے دل کے دیس میں چھوڑ گئے۔ذرا''محبت کا ایک یادگار دن'' کی ان سطروں میں جھانک کے دیکھئے:

خوابوں بھری کیا رات تھی،تعبیر جن کی ساتھ تھی
اور پھر اسی تعبیر میں، لے کر قلم تقدیر سے
سارے زمانوں سے بھرا وہ ایک دن
میرے ہی نام لکھ دیا/راہِ فنا میں عشق نے دل کو دوام لکھ دیا

سفر خواہ سارے زمانوں کا ہو یا ایک دن کا ہو......وہ ناتمام ہوتا ہےاور عشق کی راہ میں تو قع ایک ان دیکھی ڈور کی طرح ہوتی ہے جسے عاشق شاعر تھامے ہوئے چل رہا ہوتا ہے،منزل کی تمنا سے بے نیاز!

☆☆

حیدر قریشی کی نظموں کو پڑھ کر مجھے یہ اندازہ بھی ہوا ہے کہ کثیر المطالعہ قلمکار ہیں اور کئی علوم مفیدہ پر گہری نظر رکھتے ہیں جن کا مجموعی اثر ان کی تخلیقی صلاحیت پر ایک فلسفی جیسے ہوش مند و باشعور شاعر کی صورت میں جاں گزیں ہے۔ ۔۔۔میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حیدر قریشی کی نظمیں سطحی جذبہ احساس اور ہلکے پھلکے کنکر کی پروردہ نہیں بلکہ ان کی تفہیم کے لیے قاری کا بھی خاصا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ یہ بڑے امکانات کی شاعری ہےاور میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ حیدر صاحب کو ایسی اعلیٰ ادب آموز و خیال افروز نظموں کی تخلیق پر مزید توجہ دینی چاہیے۔ بڑی بے تکلفی اور بڑی بے ساختگی سے انہوں نے انگریزی الفاظ کو بھی اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

(اقتباس از مضمون ''حیدر قریشی کثیر الجہات شاعر'' از **پروفیسر آفاق صدیقی**
بحوالہ کتاب **حیدر قریشی کی ادبی خدمات**،ص ۱۳۸۔مرتب پروفیسر نذر خلیق)

شگفتہ الطاف (بھاولپور)

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری

میتھیو آرنلڈ نے ادب کو تنقید حیات کہا ہے۔ دراصل ادب کی تمام تر اساس انسانی زندگی کے پیچ وخم اور تجربات سے مزین ہوتی ہے۔ انہی تجربات کے مختلف نتائج واثرات کو اکٹھا کریں تو کوئی نہ کوئی ادب پارہ تخلیق پاتا ہے۔ جسے تخلیق کار کی شخصیت کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تخلیق کار کا رشتہ اپنی تخلیق کے ساتھ حقیقی محسوسات اور صداقت پر مشتمل ہو۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کے بقول ''سچا ادیب وہی ہے جو مصنف کے دل ودماغ کی پیداوار ہو۔ ایسے ادب کے اوراق پر خود مصنف کی چھاپ موجود ہوتی ہے۔ اس لیے کسی تصنیف کو سمجھنے کے لیے پہلے مصنف کو سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ تصنیف دراصل مصنف کے مزاج کا پرتو ہوتی ہے۔'' [۱]

گویا اپنے معاشرے اور اپنی روایت سے جڑی ہوئی کسی بھی تخلیق کو اس کے تخلیق کار کے توسط سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی طرح اردو ماہیے کا مزاج بھی اپنے معاشرے اور روایت کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کے شخصی رنگ وآہنگ سے گھلا ملا ہوا ہے جس کے طفیل ماہیا نگار کے جذبات وتجربات اور اس کی شخصیت کو آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

یہ صنفِ سخن جو پنجابی زبان سے اردو ادب میں آئی ہے اپنے ساتھ پنپنے کی بے شمار وسعتیں بھی لائی ہے۔ قبل ازیں اگرچہ اس کے مزاج اور اس کے رویئے میں پنجاب اور پنجاب کے تہذیبی وثقافتی اثرات، معاشرتی روایات، یہاں کے لوک حوالے، لوک داستانیں اور لوک محاورے نشو ونما پاتے رہے ہیں لیکن اردو زبان کی شیرینی اور اس زبان کی طلسماتی آغوش نے اس صنفِ سخن کا رنگ وروپ ایسا نکھارا ہے کہ اب اس کا جمال مایوں بھیگی دلہن کے روپ کو بھی شرمانے لگا ہے۔

''اردو ماہیئے'' پر اردو زبان کا ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اس زبان نے اسے علاقائی حدود وقیود کی پناہوں سے نکال کر وسعتوں کے افق پر عالمی ادب کے روبرو کھڑا کر دیا ہے اور بہت سے جدت پسند اور ادب پرور شاعروں نے اپنی سرپرستی کا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا ہے انہی شعرا کی فہرست میں ایک روشن نام حیدر قریشی کا ہے۔ حیدر قریشی نے نہ صرف اردو ماہیے کا بھرپور استقبال کیا ہے بلکہ اس کی محققانہ نظر نے اس صنفِ ادب کی فنی حیثیت، عروضی جائزے اور اس صنفِ کے موجدِ اول کی دریافت کا بھی جائزہ لیا ہے۔

حیدر قریشی کی ادبی شخصیت کو پرکھا جائے تو اسے مختلف الجہت شخصیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ حیدر قریشی نے اگرچہ تحقیق اور نثر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں لیکن شعری اصناف میں غزلیں۔ نظمیں اور ماہیئے حیدر قریشی کے خاص میدان ہیں جن میں ''ماہیئے'' سے حیدر قریشی کی خصوصی رغبت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ چند دہائیوں میں جو تحریک اردو ماہیئے کے حوالے سے پروان چڑھی ہے اس میں اردو ماہیے کو فروغ دینے والوں میں اہم ترین نمایاں نام حیدر قریشی کا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ حیدر قریشی اس عوامی صنف کو اردو زبان کی رنگت اوڑھے نئے اسالیب اور نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ عوام الناس میں پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس رغبت میں جہاں حیدر قریشی کی موزوں شعری طبعیت نے بہت سے خوبصورت ماہیئے تخلیق کیے وہاں فکری اعتبار سے ماہیئے کی ہئیت، مزاج اور عروضی پیمانے پر نقد ونظر کا کام بھی کیا ہے۔

اردو ماہیئے پر عروضی اعتبار سے تنقیدی کام کی ضرورت اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ یہ صنف بھی ''ہائیکو'' اور ''ثلاثی'' کی طرح عمومی ساخت کے مطابق بظاہر تین مصرعوں کی ایک نظم ہے لیکن اس کا عروضی اعتبار ہی اسے ''ثلاثی'' اور جاپان سے درآمدہ صنف ''ہائیکو'' سے جدا قرار دیتا ہے۔ اکثر لوگ بہ نظر غائر جائزہ لیے بغیر ہی ماہیئے اور ہائیکو کے درمیان فرق دریافت نہیں کرتے حالاں کہ وزن اور بحر کے اعتبار سے ان دونوں اصناف کا نمایاں فرق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے مثال کے طور پر ہائیکو کا وزن اگر ۵۔۷۔۵ نہ ہو تو وہ ہائیکو نہیں ہے اور اسی طرح ماہیئے کا وزن ۱۲۔۱۰۔۱۲ نہ ہو تو وہ ماہیا نہیں کہلا سکتا۔ دوسری صورت میں اردو ماہیئے کا درست وزن کچھ اس طرح سے ہے۔

فعلن فعلن فعلن / فعلن فعلن فع / فعلن فعلن فعلن

یا پھر پنجابی ماہیئے کی دھن پر طلوع ہونے والا اردو ماہیئے کا دوسرا وزن

معفول مفاعیلن / فعل مفاعیلن / معفول مفاعیلن

ہی درست تصور ہوتا ہے۔

محض تین مصرعوں کی ترتیب کی بناء پر ہی ''ماہیئے'' ہائیکو اور ثلاثی کو گڈ مڈ نہیں کیا جا سکتا۔ حیدر قریشی نے اسی حوالے سے اپنی فکری بصیرت اور تحقیقی وتنقیدی نظریات کا مدّلل اظہار کیا ہے

اور تاریخِ ادب اردو میں ماہیے کے مزاج، ہیئت اور وزن کے حوالے سے دیگر ماہیا نگاروں کے لیے فنی اعتبار سے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔

حیدر قریشی کی تحقیقی وتنقیدی افادیت کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی کے خوبصورت اردو ماہیے ہماری توجہ اردو ماہیے کی خوش رنگی اور خوبصورتی کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔صوتی آہنگ کے طفیل قدرتی طور پر ماہیے کی خوش بختی ہے کہ اس کی موثر دھن دیر تک دل ودماغ پر چھائی رہتی ہے۔اس پر حیدر قریشی کا منفرد اسلوب جس میں مناظر کی دھوپ چھاؤں' چشمے' کہسار' جھلیں' درپن۔وصال موسم اور سلگتے خوابوں کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔یوں بھی ماہیا چونکہ عوامی جذبات وخواہشات کا بیان ہے اس لیے اس کے اسلوب میں بھی ہمیں عوام الناس کی آواز سنائی دیتی ہے۔حیدر قریشی کے اردو ماہیے بھی امن وآشتی' دھرتی رنگ' لوک داستانوں' جذبہ محبت اور مذہبی وابستگی کے نمایاں رنگوں سے بھرے پڑے ہیں۔

اس درجہ کشادہ ہے
شہرِ علمؐ کا دل
بے حد سے زیادہ ہے [۲]

دنیا پہ کرم کر دے
پیار کی سینوں میں
پھر روشنیاں بھر دے [۳]

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے [۴]

مٹی سے محبت کا رشتہ جسم وجاں کے مصداق ٹھہرتا ہے ایک سچے فنکار کی طرح حیدر قریشی کے ''ماہیے'' جہاں آرزوؤں اور دعاؤں کے پھول برسا رہے ہیں وہاں دھرتی رنگ سے رنگے ہوئے بھی ہیں۔دھرتی کی محبت میں اسے پھول رُت اچھی لگتی ہے۔دھرتی کے رسم ورواج، شادی بیاہ کی تقریبات اس کے ماہیوں کا اثاثہ ہیں اور دھرتی کی خوشبو سے گوندھی ہوئی لوک داستانیں اس کے ماہیوں میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

مکھ دھرتی کا نورانی
جھومر پیڑ اس کے
کھیت اس کی ہیں پیشانی [۵]

چاند اور ستارے ہیں
ہم سب اس دھرتی
کے راج دلارے ہیں [۶]

مستی ہے ہواؤں میں
رات کی رانی کی
خوشبو ہے فضاؤں میں [۷]

پہلے پُر آب ہوئی
یاد میں سوہنی کی
پھر آنکھ چناب ہوئی [۸]

پنوں تھا کہ بادل تھا
آنکھ میں سسی کی
صحرا کوئی جل تھل تھا [۹]

یہی رسمِ زمانہ ہے
بابل کے گھر کو
اب چھوڑ کے جانا ہے [۱۰]

ان لوک داستانوں میں سسی پنوں کی کہانی ہو کہ ہیر رانجھا کی، سیتا رام کا قصہ ہو کہ سوہنی ماہیوال کا۔رادھا کہانی ہو کہ کرشن کنہیا۔حیدر قریشی علاقائی حدود سے بالا ہو کر سچے فنکار کی طرح لوک

داستانوں کو ماہیے کی فارم عطا کرتے ہیں۔حیدر قریشی کے ماہیوں میں مکالماتی انداز اور موضوعاتی طرزِ بیان بھی موجود ہے یعنی ہر ایک موضوع کے ذیل میں عنوان سے متعلق مختلف ماہیے اکٹھے کر دیئے گئے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ماہیوں پر اکثر اوقات اس کی منہ بولی زبان سرائیکی کا خاص اثر محسوس ہوتا ہے۔

فطری طور پر تقریباً ہر آدمی اپنی مادری زبان، مقامی روزمرہ ومحاورے اور اپنے کلچر سے انتہائی مانوس ہوتا ہے جس کا لاشعوری اظہار اس کے عمومی لب ولہجے سے ظاہر ہوتا رہتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عام آدمی کی نسبت تخلیق کار کی تخلیق میں بعض اوقات اس کی منہ بولی زبان اور مقامی کلچر کا نیا امتزاج ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر تخلیق کار کی انفرادیت کا باعث بن جاتا ہے۔یہی حال حیدر قریشی کی اردو ماہیوں میں سرائیکی کلچر اور سرائیکی الفاظ کی مٹھاس کا ہے جس سے حیدر قریشی کے ماہیوں کی فضا یکسر مختلف اور منفرد معنویت سے لبریز ہو گئی ہے۔حیدر قریشی کے شعری اسلوب میں سرائیکی الفاظ کے بے ساختہ استعمال کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق احمد لکھتے ہیں۔''ان (حیدر قریشی) کا تعلق سرائیکی علاقے اور سرائیکی خاندان سے ہے ورنہ یہ الفاظ ان کی شاعری کا حصہ نہیں بن سکتے تھے''

حیدر قریشی کے سرائیکی ڈکشن میں ''لمبے وچھوڑے''، ''کجلا بھری آنکھیں''، ''چن ماہی''، ''ڈھولا''، ''کلھم کلھا'' اور ''یادوں کا بنیرا'' ایسے دیگر الفاظ یقیناً سرائیکی زبان کے اثرات کو نمایاں کرتے ہیں۔

دن وصل کے تھوڑے ہیں
جی بھر کر مل لو
پھر لمبے وچھوڑے ہیں [۱۲]

تصویر خیالوں کی
کجلا بھری آنکھیں
''تفسیر اجالوں کی'' [۱۳]

بادل ہیں گنیرے سے
چہرا کوئی ابھرا
یادوں کے بنیرے سے [۱۴]

پنجاب رنگ اور پنجاب کی ثقافت، حیدر قریشی ہر دو حوالوں سے بے خبر ماہیا نگار نہیں ہے۔اس کے ہاں پنجاب کی ثقافت اور منظر نامے میں گُڑ کا شربت، مونجی کی چھڑائی، گندم کی کٹائی، پیتل کی پرات، پگڈنڈیاں، پیپل کی گھنی چھاؤں، آموں کا بور اور دیہاتی رہن سہن صاف دکھائی دیتا ہے۔

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر [۱۵]

پیپل کی گھنی چھایا
گزرے زمانے کا
سایہ کوئی لہرایا [۱۶]

حیدر قریشی کے ماہیوں میں صداقتوں کا پہلو بہت مضبوط پہلو ہے۔وہ ہر منظر نامے کا جائزہ بہت قریب سے لیتا ہے کیوں کہ اسے معاشرتی عذابوں اور تاریخی حوالوں کو بھی انصاف سے رقم کرنا ہے حیدر قریشی کے موضوعات میں دکھ درد کے موسم ہوں کہ وصال کے لمحات چونکہ وارداتِ قلبی کو چھو کر الفاظ

ہوئے ہیں اس لیے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

آنکھوں میں ستارے ہیں
ہجر کی شب میں بھی
وہ پاس ہمارے ہیں [۱۷]

پھرتے ہیں اکیلے میں
ساتھ نہیں کوئی
صدمات کے میلے میں [۱۸]

بے نام اداسی کو
کون سمجھ پاتا
تیرے بن باسی کو [۱۹]

حیدر قریشی کے ماہیوں میں کائنات کی خوبصورتی کھلی کتاب کی طرح موجود ہے اور ہر نظر اس میں سے اپنی پسند کے منظر نامے کو ڈھونڈ سکتی ہے۔ حیدر قریشی کی نگاہِ سخن کے مختلف زاویے اس کے ماہیوں میں موجود ہیں۔ کہیں وہ کائنات میں موجود حسن کا مطالعہ کرتا ہے اور کہیں اپنے فن میں بسے حسن و محبت کو الفاظ کی جامہ گری میں ملفوف کیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

کچھ قید سنا دیتے
عشق کے مجرم کو
کوئی تو سزا دیتے [۲۰]

کوئی وہم یا جادو تھا
رنگ ہوا، اس کا
جسم اس کا خوشبو تھا [۲۱]

اظہار ضروری ہے
پیارا گر ہو تو
اقرار ضروری ہے [۲۲]

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری میں جدید تراکیب نئے پن کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہیں۔ دھرتی کے کنگن، جھیلوں کے درپن، بیلوں کی جھانجھر، دریاؤں کی مالا، پگڈنڈیوں کے دل ایسی بے شمار ترکیبیں حیدر قریشی کو دورِ حاضر کے ماہیا نگاروں میں منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ پنجابی ماہیے کا اصل مضمون بالعموم دوسرے اور تیسرے مصرعے ہی میں پایا جاتا ہے جبکہ مصرعہ اول معنویت سے خالی رہ جاتا ہے لیکن ''اردو ماہیا'' اس عیب سے بھی پاک ہے اس کے تینوں مصرعے ایک مضمون سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ حیدر قریشی کے ماہیے، صاف ستھرے اور بامعنی اسلوب کے ترجمان ہیں گوئٹے کہتا ہے

''ایک تخلیق اس وقت خوبصورت ہوتی ہے جب وہ ترقی کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے''۔ [۲۳]

حیدر قریشی کی تخلیقی صلاحیتوں میں سے جو فیض اور جو حسن اردو ماہیے کو نصیب ہو رہا ہے اس کی اڑان ترقی کی انتہا سے کچھ دور نہیں۔ حیدر قریشی کی ماہیا نگاری اور ''اردو ماہیے'' سے بے پناہ وابستگی اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ ''اردو ماہیے'' کا مستقبل خوش آئند اور تابناک ہے۔

☆☆

کتابیات

مصنف	کتاب	ناشر	صفحہ
۱۔ڈاکٹر سلام سندیلوی	ادب کا تنقیدی مطالعہ	مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۰ء	ص۔۱۷
۲۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے	سرور ادبی اکادمی۔جرمنی۔۱۹۹۸ء	ص۔۳۲۵
۳۔حیدر قریشی	″ ″ ″	″ ″ ″	ص۔۳۲۶
۴۔حیدر قریشی	درد سمندر	زیرِ اشاعت شعری مجموعہ	
۵۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے		ص۔۳۲۷
۶۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۳۰
۷۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۳۶
۸۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۳۷
۹۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۳۷
۱۰۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۴۱
۱۱۔ڈاکٹر شفیق احمد	''حیدر قریشی کی شاعری''	میاں محمد بخش پبلیشرز، خان پور	ص۔۱۰۴
۱۲۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے		ص۔۳۵۹
۱۳۔حیدر قریشی	درد سمندر	زیرِ اشاعت شعری مجموعہ	
۱۴۔حیدر قریشی	غزلیں، نظمیں، ماہیے		ص۔۳۳۷
۱۵۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۵۶
۱۶۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۵۸
۱۷۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۶۴
۱۸۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۶۵
۱۹۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۶۵
۲۰۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۶۶
۲۱۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۶۸
۲۲۔حیدر قریشی	″ ″ ″		ص۔۳۶۸
۲۳۔سعید احمد رفیق	تاریخِ جمالیات۔	زمرد پبلیکیشنز کوئٹہ، ۱۹۷۲ء	ص۔۱۴۴

ڈاکٹر رشید امجد (اسلام آباد)

حیدر قریشی کی افسانہ نگاری

حیدر قریشی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

''میری زندگی کے سارے نشیب وفراز لاشعوری طور پر میرے شعور کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں لہٰذا میری عملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور سوالات ہی میرے کسی نظامِ فکر کی تشکیل کا باعث بنے ہوں گے اور لاشعوری طور پر سہی کسی نہ کسی رنگ میں میری تخلیقات میں درآئے ہوں گے۔''

(**جواز جعفری سے گفتگو**
مشمولہ **حیدر قریشی کے انٹرویوز** مرتب سعید شباب)

حیدر قریشی کے اس اقرار کے باوجود کہ انہیں تصوف سے دلچسپی ہے، ان کی کہانیوں کا خام مواد حقیقی زندگی کے منظر نامہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ تصوف درویشی اور کسی حد تک گوشہ نشینی کا احساس دلاتا ہے لیکن اگر تصوف کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اپنے وقت کے تمام بڑے صوفی، اپنے عہد سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ کسی نے درست کہا ہے کہ ان کی محفلیں عوامی دربار تھے جن میں ہر شخص اپنے مسائل کے ساتھ موجود ہوتا تھا۔ روحانیت ان کا باطنی سفر تھا، گویا وہ دو دنیاؤں میں رہتے تھے۔ حیدر قریشی کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے، یہ ذکر یوں ہوا کہ حیدر قریشی بھی دو دنیاؤں کا مسافر ہے، ایک اس کا باطنی مکاشفہ اور دوسرے ارد گرد کی دنیا کا عملی تجربہ۔ چنانچہ اس کی کہانی دو سطحوں پر اپنی تفہیم کراتی ہے، اس کا خمیر اپنے عہد کی سماجی وسیاسی صورتِ حال سے اٹھتا ہے اور فکری طور پر وہ ایک اَن دیکھی دنیا کے اسرار بھی رکھتی ہے کہ قاری جس سطح پر چاہے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

حیدر قریشی نے متعدد بار کہا ہے کہ میں خوابوں اور حقیقتوں کے درمیان زندگی بسر کر رہا ہوں، پرانی اصطلاحوں میں وہ بیک وقت حقیقت اور آدرش کے درمیان کہیں جینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک حوالہ سے یہ مسلسل عذاب اور سلگتے رہنے کی صورت بھی ہے کہ حقیقت اور آدرش دو مختلف منطقے ہیں۔ صرف

حقیقت کو سب کچھ سمجھ لینے والا خوابوں سے محروم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ خوابوں میں رہنے والا حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ سچا ادیب ان دونوں کے درمیان ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیاں اپنے عہد کی سچائیاں ہیں لیکن ان کی اندرونی پرتوں میں خوابوں کی لذت بھی موجود ہے، جو ہر بڑے ادیب کا خاصہ ہوتی ہے۔

حقیقت اور خوابوں کے درمیان جو کشمکش ہے وہی زندگی ہے، اس حوالے سے حیدر قریشی کے تخلیقی عمل کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں دو سطحوں پر موجود ہیں، اول معاشرے کے ایک نقاد اور دوسرے معاشرے کی موجود صورتِ حال سے اوپر اٹھ کر تخلیقِ انسان کے بنیادی مسائل پر غور وفکر کرتے ہوئے ایک صوفی کی حیثیت سے، اس کا اظہار بھی دونوں طرح ہوا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں سیدھے سادے معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں اور ان کا بیانیہ بھی تفہیم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا، لیکن ان کی بعض کہانیوں کے موضوع گنجلک اور باطنی کشف کی روداد ہیں۔ ایسی کہانیوں کے بیانیہ میں انہوں نے اسطور کے ساتھ ساتھ مذہبی کتابوں خصوصاً بائبل کے اسلوب کی پیروی کی ہے۔ بشارت ان کے یہاں ایک خاص استعارہ بھی ہے اور سچائی کی راہنمائی کرنے والی ایک علامت بھی۔

فرحت نواز نے اپنی ایک گفتگو میں کہا ہے کہ ''حیدر قریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجود ہیں۔ خود اس طرح کہ ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہیں، بعض کھلی کتاب کی طرح ہیں لیکن ایسی کھلی کتاب جس کے معانی مسلسل کھلتے چلے جاتے ہیں۔'' یہ رائے حیدر قریشی کی حقیقت نگاری کے رویے کی تائید کرتی ہے۔ ہر لکھنے والا سب سے پہلے ایک ماحول اور ایک معاشرے میں زندہ ہوتا ہے۔ اس کی محبتیں، دشمنیاں اور نفرتیں اس کے لائحہ عمل کا تعین کرتی ہیں اور بعض کرداروں کو محبت اور بعض کو نفرت کا استعارہ بناتی ہیں۔ قریب کے جاننے والے بعض اوقات ان میں سے اصل چہرے بھی ڈھونڈھ لیتے ہیں لیکن دور بیٹھا قاری سارے نتائج کو اپنے آس پاس کے ماحول پر منطبق کر کے دیکھتا ہے یہ آفاقی سچائیوں کے زمرے میں آتا ہے کہ کسی کہانی کار کے کردار ان کے عمل اور افکار کس حد تک دوسروں کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں لیکن یہ صرف کہانی کی اوپری پرت ہے۔ ہر کہانی کے اندر ایک اور کہانی ہوتی ہے اور جو افسانہ نگار کہانی کی ظاہری سطح کے اندر ایک اور کہانی پیدا کر دینے کا فن جانتا ہے وہ بڑا افسانہ نگار ہے، حیدر قریشی کی اکثر کہانیوں میں یہ خوبی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرحت نواز نے اگر ایک طرف حیدر قریشی کی کہانیوں کی حقیقی صورت حال کا ذکر کیا ہے تو ڈاکٹر سعادت سعید کے نزدیک ''حیدر قریشی نے دورِ جدید کے سائنسی اور تکنیکی انقلاب اور تہذیبِ نو کی کنہ کی تنقیدی تفہیم کی ہے۔''

سچا ادیب آگہی کی جس اذیت سے گزرتا ہے اس کا اظہار حلاج کی طرح ہو جائے تو موت کا پھندا ہر وقت منتظر ہے اور اظہار نہ ہو تو سچائی کا کرب اندر ہی اندر کاٹتا رہتا ہے، توڑتا رہتا ہے۔ اس اندرونی توڑ پھوڑ کا اظہار کس سطح پر ہو یہی ادیب کے مقام کا تعین کرتا ہے، خود حیدر قریشی کو بھی اس کا احساس ہے ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک گفتگو میں انہوں نے کہا ''لکیر کے فقیر معاشرہ میں آزادانہ غور و فکر کرنے والوں کے لیے ایک طرف آگہی کی اذیت ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرے کی ملامت۔۔''۔۔اور یہ تو بالکل سچ ہے کہ آگہی کی اذیت ہی سے گزر کر بڑا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اب اس حوالے سے حیدر قریشی کی کہانیوں کو دیکھ لیں تو صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے۔ ان کی کہانیاں بظاہر سیدھی سادی ہوں یا کسی فکری مکاشفہ کی دریافت ان میں آگہی کا کرب پوری طرح موجود ہے، یہی ایک سچے فنکار کی پہچان اور جواز ہے۔

ہر فنکار کے ذاتی کوائف کسی نہ کسی حوالے سے اس کے فن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی فکر کا تعین بھی کرتے ہیں۔ کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے ہر ادیب ایک عذاب سے گزر رہا ہوتا ہے کہ اس کے آس پاس جو بے انصافی ہو رہی ہے اس کے مداوے کے لیے وہ کیا کرے۔ وہ اپنے آپ سے بھی لڑتا ہے اور معاشرے کی مجموعی خرابیوں کے خلاف بھی آواز اٹھاتا ہے۔ ٹوٹتا ہے، جڑتا ہے اور اپنا اظہار کرتا رہتا ہے لیکن حیدر قریشی کو دوہرے عذاب سے گزرنا پڑا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں اسے وطن چھوڑنا پڑا اس کے بارے میں جواز جعفری کے اس سوال کے جواب میں کہ ''آپ نے بخوشی وطن چھوڑا یا جلا وطن کیے گئے'' حیدر قریشی نے کہا ''جلا وطن تو نہیں کیے گئے لیکن وطن کو بخوشی نہیں چھوڑا۔'' وہ بڑی فراخ دلی سے اپنی جلا وطنی کو ''خود ساختہ'' کہتے ہیں۔ یہاں اس جلا وطنی کا تجزیہ کرنے کی گنجائش نہیں لیکن اس دوہری اذیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس سے حیدر قریشی گزرے ہیں، شاید ابھی تک گزر رہے ہیں۔۔۔ پاکستان چھوڑنے سے پہلے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کے ایک افسانہ پر وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کی وجہ سے انہیں ملک چھوڑنا پڑا۔ صورت حال تو کئی برس سے موجود تھی اس حد تک کہ حیدر قریشی کو روزگار سے محروم ہونا پڑا لیکن یہ ایک افسانہ جواز بن گیا۔

''روشنی کی بشارت'' ایک استعاراتی نام ہے۔ اس مجموعے کی کہانیاں دونوں سطحوں پر معنوی پرتیں کھولتی ہیں۔ سیدھی سی کہانیاں بھی عام معنوں ہیں اکہری نہیں۔ سادہ معنویت میں بھی ان کا جواز موجود ہے۔ اس مجموعہ کی جو کہانیاں فکری دبازت کا پہلو لیے ہوئے ہیں ان کا اسلوب بھی نیم استعاراتی ،استعاراتی اور کہیں علامتی ہے۔ ان میں اساطیری اسلوب کی جھلک بھی ہے اور کتاب مقدس کے بعض استعارے بھی اپنے عصر سے جوڑے گئے ہیں۔ جدید افسانے میں اس مجموعہ کی اہمیت ہے اور جدید

افسانے کے ذکر میں اسی کا حوالہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ ناصر عباس نیّر نے ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے کہا ہے کہ ستر کی دہائی والی نسل نے اوّلاً جدیدیت کے اثرات قبول کیے اور بعد ازاں اس جدیدیت کا محاسبہ کیا۔ محاسبہ کرنے والوں میں حیدر قریشی بھی شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب کوئی تحریک یا رجحان فیشن کی طرح مقبول ہوتا ہے تو اصل اور نقل کا فرق مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر بڑی تحریک کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں کتنے ہی لوگ صرف نقادوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ترقی پسند بن بیٹھے تھے یہی کچھ ساٹھ کے بعد بھی ہوا لیکن ستر میں محاسبہ کرنے والے ستّر کے بعد کے لوگ ہی نہیں خود ساٹھ کی دہائی کے اچھے لکھنے والے بھی اپنا محاسبہ کر رہے تھے، پھر یہ کہ خارجی منظر نامہ میں ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔ موضوعات کے حوالے سے اور وہ کہانی جو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بالکل خارجی اور ساٹھ کی دہائی میں ردعمل کے طور پر باطنی ہو گئی تھی، ستّر میں مجموعی طور پر خارج اور باطن کے امتزاج کی صورت ظاہر ہوئی اور صرف ستّر کے بعد کے لکھنے والوں کی سوچ نہیں تھی، خود ساٹھ کے لکھنے والے جواب مستحکم ہو گئے تھے اور عجزِ فن کی منزل سے بھی نکل آئے تھے، اس تبدیلی کے محرک تھے۔ انتظار حسین، انور سجاد، خالد حسین اور منشا یاد کی ساٹھ اور ستّر کی کہانیوں میں یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے، اس لیے یہ دعویٰ کہ یہ تبدیلیاں ستّر کی نسل کی دین ہیں، درست نہیں، انہیں کسی ایک نسل کی بجائے مجموعی اور عصری ارتقاء کے حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

حیدر قریشی کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۲ء میں چھپ گیا تھا۔ اس مجموعے کی کہانیاں ''میں انتظار کرتا ہوں''، ''روشنی کی بشارت''، ''حوا کی تلاش''، ''اپنی تجرید کے کشف کا عذاب'' اور ''ایک کافر کہانی'' اپنے عنوانات ہی سے اپنی فکری سمت کا تعین کرتی ہیں، ان کہانیوں میں تصوف کی وراثت کہانی کے باطن میں موجود ہے۔ اسلوب کے حوالے سے بھی یہ کہانیاں دبیز اسلوب کی ذیل میں آتی ہیں۔ جب یہ مجموعہ چھپا تھا اس وقت بھی اسے جدید اور اردو افسانہ میں شامل کیا گیا تھا۔

حیدر قریشی کا دوسرا مجموعہ ''قصہ کہانیاں'' (پہلے مجموعے کی کہانیوں سمیت ''افسانے'' کے نام سے) ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ ہر جینوئن ادیب کا دوسرا مجموعہ پہلے مجموعے سے اگلا قدم ہوتا ہے، سوچ کے حوالے سے بھی اور اسلوب کے حوالے سے بھی لیکن ان میں ایک باطنی تسلسل بھی ہوتا ہے جو ادیب کی بنیادی پہچان ہے۔ حیدر قریشی کے دوسرے مجموعہ میں بھی کئی کہانیاں ان کے پہلے مجموعہ کے فکری تسلسل اور ایک قدم آگے کے سفر کی روداد ہیں، مثلاً ''دو کہانیوں کی ایک کہانی'' میں ''منطق الطیر'' بھی موجود ہے اور شاہ جی کے روپ میں ایک صوفی بھی جو قدم قدم اپنے مرید کی فکری راہنمائی کرتا ہے۔

حیدر قریشی کو فکری طور پر میں ایک جدید ترقی پسند افسانہ نگار سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے افسانے

سماجی زندگی کے خمیر سے تیار ہوتے ہیں اور معاشرے کے دکھ اور مظلوم کی بے بسی ان میں موجود ہے اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے موضوعات ترقی پسند ہیں اور معاشرے کو بدلنے کا آدرش رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں کو سیدھے بیانیہ میں پیش نہیں کیا بلکہ تخلیقی تجربے سے گزر کر ان کے لیے اظہار کی ایسی زبان وضع کی ہے جس میں استعارہ اور علامت دونوں موجود ہیں بلکہ اکثر انہوں نے تصوف کی اصطلاحات اور اساطیری حوالوں سے بھی کام لیا ہے جو انہیں جدید بناتے ہیں۔حلقہ اربابِ ذوق نے موضوع کے ساتھ ساتھ فن پارے کی ادبی حیثیت کو بھی ضروری قرار دیا تھا۔ساٹھ اور بعد کی ادبی نسلوں کی تربیت زیادہ تر حلقہ ہی میں ہوئی ہے۔حیدر قریشی بھی فکری طور پر حلقہ ہی کے پروردہ ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں موضوع کی وسعت کے ساتھ ساتھ فنی حوالے بھی موجود ہیں اور وہ فنی جمالیات کے پوری طرح قائل ہیں۔

حیدر قریشی شاعر بھی ہیں، شاید افسانے کی طرف وہ بعد میں آئے ہیں۔شاعر ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کا جملہ شعری خوبیوں یعنی لفظوں کے دروبست، اختصار، معنوی دبازت اور تخلیقی جمالیات سے آراستہ ہے۔ادھر کچھ عرصہ سے انہوں نے باقاعدہ تنقید بھی لکھی اور یادداشتوں کے ساتھ ساتھ مختلف بین الاقوامی موضوعات کو بھی اپنایا ہے، یہ ان کی ہمہ جہتی کا اظہار ہے لیکن میرے نزدیک ان کی دو حیثیتیں زیادہ نمایاں ہیں، ایک شاعر اور دوسرے افسانہ نگار، یہ دونوں تخلیقی حیثیتیں ہیں اور غیر محسوس طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔حیدر قریشی کے افسانوں کا اختصار، جملہ کی گرفت، ہر جملے کا دوسرے جملے سے ایسے جڑا ہونا جیسے زنجیر کی کڑیاں ہوں، مترنم لفظوں کا انتخاب اور کہانی کی مجموعی بُنت میں ماورائی تخلیقی ذہن، ان کی شاعر ذات کی دین ہے۔

حیدر قریشی کے دونوں افسانوی مجموعے ان کے فنکارانہ سفر کے دو مرحلے ہیں ان میں ایک فنی اور فکری ارتقاء ہے جو ان کی اگلی منزل کی نشاندہی کر رہا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے مجموعی سفر میں بھی یہ دونوں مجموعے اپنی اہمیت اور پہچان رکھتے ہیں۔☆☆

''(حیدر قریشی) کثیر الجہت لکھنے والے ہیں۔تحریر بہت دلکش ہوتی ہے۔۔۔۔ان کی تحریروں میں کشمکشِ زیست غالب عنصر ہے۔مگر ان کی شاعری میں تہذیبی جلاوطنی اور سیاسی متعلقات بھی ہیں۔ان کے شعری اسلوب میں سرائیکی لسانیات کا اردو میں نفوذ بھی نظر آتا ہے۔شعری صنف ''ماہیا'' پر ان کا کام بڑے معرکے کا ہے۔وہ خواب گر بھی ہیں اور خواب شکن بھی۔۔۔۔''

(**احمد سہیل** بحوالہ کتاب **انٹرویوز مرتب** : **سعید شباب** ص ۱۳۵،۱۳۶)

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی (کلکتہ)

ایٹمی جنگ

ادبی دنیا میں حیدر قریشی کے نام اور کام کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔موصوف صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ادیب، خاکہ نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، یادنگار اور نقاد بھی ہیں۔اردو صحافت میں بھی انہوں نے عالمی سطح پر اپنی شناخت بنائی ہے۔بہت ہی قلیل مدت میں حیدر قریشی کئی کتابوں کے مصنف اور مولف کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان قائم کر چکے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ ''ایٹمی جنگ'' میں مصنف کے تین مختصر افسانے ''حوا کی تلاش''۔''گلاب شہزادے کی کہانی'' اور ''کاکروچ'' شامل ہیں۔یہ سبھی افسانے سائینس کی تباہ کن دریافت ایٹم کے تناظر میں پُر مغز علامتی پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔حوا شروع سے ہی ذہنی اور قلبی تسکین کی علامت سمجھی جاتی ہے جس کی جستجو میں ابن آدم ہر طرح کے جتن کرتا ہے۔ایٹم کی کھوج بھی اسی فکر سے متعلق ہے۔چنانچہ آج ایٹم بم جیسا تباہ کن ہتھیار اتنی کثیر تعداد میں جمع کیا جا چکا ہے کہ بقول مصنف ''یہ دنیا کو پانچ بار فنا کر دینے کے لیے کافی ہے'' اور حال یہ ہے کہ حرص دنیا میں ہر شخص دوسرے سے اپنی برتری تسلیم کرانے اور اپنا تسلط جمانے کی دھن میں ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے استعمال سے صید اور صیاد دونوں ہی کی موت یقینی ہے پھر بھی ایٹم بم سے وابستہ ہلاکتوں کو گلے لگانے کے درپے ہے۔یعنی کہ ''زندگی چاہنا اور موت کا ساماں کرنا''۔

یہ صورت حال حیدر قریشی کی فکر و تشویش کا سبب ہے۔اسی بے چین احساس میں انہیں فوج ابرہہ کی پسپائی پر رشک آتا ہے کہ وہ تو صرف ''کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیئے گئے تھے'' اور ایٹم کی تباہ کاریاں؟ معاذ اللہ!! چنانچہ وہ ایٹم یا حطمہ کا تعارف قرآن پاک کے لفظوں میں یوں کراتے ہیں کہ ''تم کو نہیں معلوم کہ یہ حطمہ کیا چیز ہے۔یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک اتر کر ریزہ ریزہ کر دے گی (**سورہ الھمزا**) حطمہ کے لغوی معنی ڈنکن فاربی نے بھی قریب قریب یہی لکھے ہیں **جزو لا یتجزا** (ایسے ذرات میں تبدیل کر دینا کہ پھر ان ذروں کو ٹکڑے کرنا ممکن نہ ہو)۔یہی احساس'' روشنی کا وہ ہالہ'' ہے جو حیدر قریشی کے اشہب فکر کو قرآن پاک کی دوسری سورتوں اور آیتوں مثلاً القاریہ

نمبر۱۰۱۔الزلزال ۹۹۔المومن۲۴ آیة ۸۲تا ۸۵،سورہ یٰسین ۳۶ آیة ۷۷۔۷۸،سورہ الشوریٰ ۴۲،آیة ۲۸،سورہ الفجر ۸۹آیة ۲۷،۲۸اور سورہ الرحمن ۵۵تک پہنچا تا ہے جن میں مستقبل کا اور بھی بہت کچھ کچا چٹھا سامنے آجاتا ہے۔اس روشنی کے ہالے میں حیدر قریشی کو ملک السمٰوات والارض کی پسندیدہ راہوں کواختیار کرکے ہی حوایعنی تسکین کی جستجو میں فلاح نظر آتی اوراس کی بازیافت ممکن محسوس ہوتی ہے۔شرط یہ ہے کہ انسان ''نفس مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب سے اس حال میں رجوع کرے کہ وہ اسے پسند کرنے والا بھی ہواوراس کا پسندیدہ بھی (سورہ الفجر ۸۹) ۔ورنہ یہ ایجادات اور ترقیاں یا ساری روشنی طبع بلا بن کر بھی نمودار ہوسکتی ہے جس کی قرآن پاک میں یوں خبر دی جا چکی ہے ''تم پر آگ کا شعلہ اور تانبا گرایا جائے گا پس تم ہرگز غالب نہیں آسکتے'' ان حقائق سے درس عبرت لے کر نئی امنگوں اور حوصلوں سے اس روشنی کے ہالے میں جب وہ بقائے نسل انسانی کی فکر میں آگے بڑھتے ہیں تو انہیں اپنا درِ مقصود حاصل ہوجاتا ہے اور دل پکار اُٹھتا ہے ''پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کا انکار کروگے۔''

گلاب شہزادے کی کہانی میں اس دورترقی کے چار مناظر چار درویشوں کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔قصہ چہار درویش کی طرح یہ درویش بھی رات گزارنے کے لیے اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔افسانے کی شروعات اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ہوا شہکار جب اس کا مکمل وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

حقیقت میں یہی شعران چاروں مناظر کی روح اوراس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔افسانے کے سماجی اور معاشرتی پہلوؤں اور تقاضوں سے قطع نظر انسان کی بڑھتی ہوئی ہوس کو ظاہر کرتے ہوئے تیل کے چشموں یعنی دنیا کی عظیم دولت کی جانب اٹھنے والی للچائی نگاہیں اوران کو ہتھیا لینے کی فکر اور بالآخر وہیں پر انسانیت کی موت کا قصہ ہے جسے مصنف نے علامتوں،تلازموں،استعاروں اور تشبیہوں کے ملبوس میں سجا کر پیش کیا ہے۔شروع افسانے میں حیدر قریشی نے اشارتاً لکھا ہے ''خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے،خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہوجاتا ہے'' بظاہر اس جملے کا کوئی موقعہ ومحل نہیں ہے لیکن دراصل یہی وہ آئینہ ہے جس میں انہوں نے حرص وہوس،خودغرضی اور خود پرستی کی وہ تصویریں دکھائی ہیں جب ایک بھائی مال وزر کی خاطر دوسرے بھائی کی جان لے لیتا ہے۔بیوی عیش کوشی کی فکر میں اپنے منصب سے خیانت کرتی ہے۔خوشحال زندگی کے خواب میں منصوبہ بندی کے نام پر والدین اپنی ہی اولاد کا قبل از ولادت قصہ تمام کردینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔اورآتش حسد جلانے والا خود ہی اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جل کر خاکستر ہوجاتا ہے۔غرضیکہ لب بام تک پہنچتے

پہنچتے ہر کمند ہوس ٹوٹ جاتی ہے۔کہانی کا انجام پہلے افسانے کے برخلاف المناک اور مایوس کن ہے۔تیسرے اور آخری افسانے کا پس منظر بھی ایٹمی جنگ کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ہے۔اسلوب نگارش تحیر (Suspence) پیدا کرتا ہے۔انداز بیان ڈرامائی ہے۔دوستوں کے مکالمے قصے کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔افسانے کا رنگ ڈھنگ سائیٹفک ہوتے ہوئے بھی فکشن ہے اور فکشن میں ایٹمی جنگ کے بعد روئے زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ جانا کوئی عجوبہ نہیں۔تاہم یہ ضروری ہے کہ اس میں ہر قسم کی شعاع زنی کو جذب کرسکنے کی صلاحیت ہو جیسے کہ مکھی یا بالفرض کاکروچ۔جب تابکاری اثرات سے ان کی نشو ونما ہوگی تو مستقبل میں یہی کاکروچ زمین کے مالک ہوں گے۔یہیں سے کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے اور دوست اس سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں۔یہ تصورانہیں گھبراہٹ میں مبتلا کردیتا ہے۔

مصنف کا خیال ہے کہ برصغیر کے عوام کو بھی اب ایٹمی جنگ کے نتائج یعنی ایک کی موت کے ساتھ ہی دوسرے کی یقینی ہلاکت کا اندازہ ہوگیا ہے تو پھر کیوں نہ سب مل کر محبت کو عام کرنے کی جدوجہد کریں اور پوری دھرتی کو ایک ملک بنالیں اوراس ملک کے باشندے کہلانے میں خوشی محسوس کرنے لگیں تو شاید ایٹمی جنگ کے سارے خطرات ختم ہوجائیں۔یہی اس کتاب کا مرکزی خیال ہے اوراس مجموعے کی شانِ نزول اس دھرتی پر بقائے نسلِ انسانی کی فکر ہے۔زبان صاف سادہ اور عام فہم ہے لیکن علامتی انداز بیان،استعاروں کی تفہیم نیز تشبیہات اور تلازموں کی تہہ داریاں نہایت غور طلب ہیں۔مصنف کا لب ولہجہ سبک اور پُرخلوص ہے۔اس نوعیت یا اسی طرح کی مثبت قدروں کی حامل تحریریں اس نفرتوں بھرے دور کا تقاضا ہیں۔حیدر قریشی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے وقت کی ایک اہم ضرورت کی جانب ہمیں متوجہ کرنے کی مستحسن سعی کی ہے۔اس کتاب کی یقیناً خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

☆☆

''(۱۹۸۰ء،۱۹۸۲ءاور۱۹۹۲ءکی لکھی ہوئی) میں اپنی تینوں کہانیاں ایک ساتھ پیش کررہا ہوں۔ انڈیا اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے سیاسی پس منظر سے قطع نظر،میرے لیے یہ نئی صورتحال قدرے اطمینان کا موجب بن رہی ہے کہ دونوں طرف یہ احساس ہونے لگا ہے کہ کسی ایک کی ہلاکت کا مطلب لازمی طور پر دوسرے کی بھی ہلاکت ہے۔اس بات کو اچھے انداز میں کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انڈیا اور پاکستان کا جینا،مرنا اب ساتھ ساتھ ہے۔غور کیا جائے تو یہ ساتھ جینا اور ساتھ مرنا تو محبت کا مقام ہے۔تو پھر کیوں نہ ہم سب مل کر محبت کے اس مقام کو پہچانیں!''

(۱۲رجولائی ۱۹۹۸ءکو لکھے گئے حیدر قریشی کی کتاب **ایٹمی جنگ** کے پیش لفظ سے اقتباس)

سلیم انصاری (جبل پور)

حیدر قریشی کے افسانوں کی حقیقت

حیدر قریشی ایک کثیر الجہت تخلیقی فنکار ہیں۔ وہ بیک وقت کامیاب جدید شاعر بھی ہیں اور صاحبِ طرز افسانہ نگار بھی۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں نظم ونثر کا گہرا تنقیدی شعور بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حیدر قریشی کے یہاں اردو ادب میں ہیئت ومواد ہر دو سطح پر نئے نئے تجربات کو خوش آمدید کہنے کا پُرخلوص جذبہ بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پنجابی صنفِ سخن ماہیا کو اردو میں صحیح وزن پر رائج کرنے میں سب سے نمایاں رول ادا کیا ہے، جس کے لئے اردو والے بجا طور پر حیدر قریشی پر فخر کر سکتے ہیں۔

''روشنی کی بشارت'' حیدر قریشی کے ان افسانوں کا انتخاب ہے جو اپنے پیرایۂ اظہار، موضوعات اور اسلوب کی انفرادیت کے سبب اردو افسانوں میں خصوصیت کا حامل ہے۔ روشنی کی بشارت میں شامل افسانے، جدید افسانوں پر تجریدیت، ابہام، انتشار، قنوطیت اور بے ربطگی وغیرہ جیسے تمام الزامات کو ردّ کرتے ہوئے ایک نیا جہانِ معنی خلق کرتے ہیں جس سے حیدر قریشی کی سوچ، وژن اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں کی تفہیم کے باب میں ڈاکٹر فہیم اعظمی کی درج ذیل رائے خاصی اہمیت رکھتی ہے:

> ''حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔''

ڈاکٹر فہیم اعظمی کی رائے کی روشنی میں حیدر قریشی کے افسانوں کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کے یہاں کہانیاں علامتی/اساطیری ہونے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے مسائل ومصائب کا براہِ راست اظہار ہیں۔

حیدر قریشی کی کہانیوں کا ٹریٹمنٹ عام کہانیوں سے مختلف اور منفرد ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں پر داستانی رنگ غالب ہے مگر ان کے لہجے کا خوشگوار دھیما پن اور اسلوب کی انفرادیت انہیں داستانوں کے ماحول سے الگ بھی رکھتی ہے۔ حیدر قریشی اپنے باطن کی روشنی کو تجربے کے منشور سے گزار کر

روحانی/مذہبی عقیدوں کا ایمان افروز اسپکٹرم (SPECTRUM) تخلیق کرتے ہیں، جو یقینی طور پر ان کی کہانیوں میں روشنی کی بشارت کا اعلامیہ ہے۔ حیدر قریشی کے یہاں روشنی ایک کلیدی استعارہ ہے جو ان کے افسانوں کے کینوس کو وسیع کر کے ان کی معنویت کے نئے امکانات کو روشن کرتا ہے۔ حیدر قریشی اپنی کہانیوں میں بار بار ایک ایسی روشنی کا حوالہ دیتے ہیں جو قلندروں، درویشوں اور مستوں کے قلوب کو منور اور معطر کرتی ہے۔ جو انسانوں کو ذات کے اندھیرے سے نکال کر ایمان افروز روحانی جذبوں اور عقیدوں سے معمور کرتی ہے۔

افسانہ ''روشنی کی بشارت'' کا مرکزی کردار (جو حیدر قریشی خود ہیں) شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر اعلان کرتا ہے:

> ''لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لا کر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے۔
> نورِ بصیرت سے محروم لوگو! تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے'' (روشنی کی بشارت)

> ''اچانک ساری روشنیاں گل ہو گئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے۔
> تم جس مصنوعی روشنی کی باسی ہو اس کا طلسم ٹوٹ جائے تو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔
> میں اس سے کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا کیونکہ روشنیاں پھر آ گئی ہیں، میرا اندھا پن بھی آ گیا ہے۔'' (اندھی روشنی)

> روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک ہالے کی شکل اختیار کر گئی ہے اور مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے'' (حوا کی تلاش)

> ''روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے: اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے؟'' (حوا کی تلاش)

حیدر قریشی اس روشنی کی بشارت دیتے ہیں جو انسان کے ضمیر کی روشنی ہے، جو خود کو خدا کے حوالے کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کو سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔ حیدر قریشی ایک ایسی روشنی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں جس میں انسان کی ذات اس پر روشن ہوتی ہے۔ کہانی ''روشنی کی بشارت'' میں حیدر

قریشی نے جب سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ ہاتھ میں لے کر روشنی کی بشارت دی تو لوگوں نے تمسخر اڑایا۔یہاں تک کہ ان کی ماں بھی انہیں تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے۔ان کی بیوی نے بھی سنجیدگی نہیں دکھائی۔ایسا ہر دور میں ہوتا ہے۔سچائی پر چلنے والے اور سچائی کی راہ دکھانے والے ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں۔تکلیفیں اٹھاتے ہیں،اذیتیں برداشت کرتے ہیں اور جن کے یہاں ایمان کی توانائی تازہ ہوتی ہے،جن کے باطن روشن ہوتے ہیں،وہ آخر ایک دن اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

کہانی ''اندھی روشنی'' میں حیدر قریشی نے اس سچ کے اظہار کی کوشش کی ہے کہ دنیاوی عیش و آرام اور آسائشیں حاصل کرنے کی ہوس میں انسان اندھا ہو جاتا ہے،اپنے ضمیر اور باطنی سچائیوں کی توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔''حوا کی تلاش'' میں حیدر قریشی نے بتایا ہے کہ انسان جب خدا کے سامنے خود سپردگی کے احساس سے گزرتا ہے تو روشنی اس کے باطن میں نمودار ہونے لگتی ہے اور وہ رضائے الٰہی کے عظیم جذبے سے گزر کر انکشافِ ذات تک پہنچتا ہے۔

حیدر قریشی کی کہانیوں کا کلیدی کردار بار بار اپنی ذات کی دریافت کے لامتناہی عمل سے گزرتا ہے۔وہ اپنے آپ سے متعدد سوال کرتا ہے،ایسے سوالات قائم کر کے حیدر قریشی نے اپنی کہانیوں کو ایک نئی تخلیقی لذت سے آشنا کیا ہے۔دلچسپ بات یہ کہ ان تمام سوالات کے جوابات بھی ان کی کہانیوں میں ایک کے بعد ایک روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس طرح دیکھیں تو حیدر قریشی کی کہانیوں میں نفسیاتی،نظریاتی اور روحانی گتھیوں کو دکھانے اور سلجھانے کا عمل موجود ہے۔حیدر قریشی کی کہانیوں میں ایک اور بات جو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی کہانیاں اکثر ایک چھوٹے سے واقعے سے شروع ہو کر،تلاشِ ذات کے سفر سے گزرتے ہوئے روحانی رنگ کے مختلف منظروں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔

کہانی ''پتھر ہوتے وجود کا دکھ'' بظاہر ایک معمولی سے واقعہ سے شروع ہوتی ہے۔جس میں کہانی کا کردار جو ایک بچہ ہے،جادو کی کتاب سے ایک کھیل پڑھ کر اُسے عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔تبھی پڑوس کی ایک خوبصورت بچی بھی اس کھیل کی حیرتوں میں شامل ہو جاتی ہے۔لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے،یہ دونوں کردار بھی اپنی سرحدیں عبور کر کے جوانی کے حیرت انگیز تجربات کے گواہ بن جاتے ہیں اور پھر کہانی پر فلسفیانہ رنگ غالب آنے لگتا ہے جس کے ثبوت کے طور پر افسانے کا اختتامی حصہ حاضر ہے:

''شہنائیوں کی دُھن سے میرا وجود سن ہوتا جا رہا ہے۔

چہرے کے علاوہ مرا باقی جسم پتھر ہو گیا ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جس میں میں نے اپنے اور اس کے بچپن میں پانی میں آگ کا کھیل کھیلا تھا۔وہ ابھی تک پانی میں آگ کو دیکھنے کے بعد مجھے حیرت سے دیکھ رہی ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جب روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور جسم سے اُتر کر میری روح میں رقص کرنے لگی تھیں۔

اس کی ڈولی روانہ ہونے والی ہے اور میں اپنے کہے لفظوں کی تردید کرتا ہوں:

''اس نے سچ کہا تھا۔ہم سب مردہ کیڑے ہیں جو قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں متحرک ہونے کے سبب زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

اب مجھے اس کی انجانی اداسی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔

میرا چہرہ بھی پتھر ہونے لگتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرا سارا چہرہ پتھر ہو جائے اس کے جسم سے میری روح میں اترنے والی خوشبوئیں میری سانسوں میں جم کر مشک کافور کی کئی ٹکیاں سی بن جاتی ہیں۔اس کی غزالی آنکھوں سے طلوع ہونے والی روشنیوں سے ان میں آگ لگتی ہے اور پھر میری آنکھوں کے پانی میں آگ تیرنے لگتی ہے۔اور میں اس پانی میں ڈوب کر اور اس آگ میں جل کر خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی آخری کوشش کرنے لگتا ہوں۔تاکہ زندگی کا کچھ تو بھرم رہ جائے!''

حیدر قریشی ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن کے یہاں موضوعات کا تنوع اور رنگارنگی ہے۔وہ نظم و نثر دونوں پر یکساں تخلیقی قدرت رکھتے ہیں۔بقول دیوندر اسر

''حیدر قریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے،سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔ایسی کہانیوں میں اس نوع کا سچ نہیں جسے اکثر ہم مجسم سچ،کائناتی سچ،سماجی سچ یا نام نہاد بھوگا ہوا سچ کہتے ہیں کیونکہ ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے،روح کا سارا آکاش ہے،جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکر اور قوت متخیلہ ہے''

حیدر قریشی ایک بے حد فعال اور Dynamic تخلیق کار ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کی تخلیقات میں اسلوب اور پیرایۂ اظہار مسلسل ارتقا پذیر رہتا ہے،جو ان کی تخلیقی توانائیوں کی ضمانت ہے۔

☆☆

''مجھے ان کی ساری تحریریں اچھی لگی ہیں،ان کے خاکوں اور ماہیوں نے براہ راست متاثر کیا۔ان کی تحریروں میں اور بالخصوص افسانوں میں جہاں صوفیانہ ٹچ آتا ہے وہاں ان کا فن اپنے کمال پر ہوتا ہے۔''

(**رضیہ اسماعیل**،برمنگھم،انگلینڈ بحوالہ **انٹرویوز مرتب : سعید شباب** ص۱۴۲)

منشا یاد (اسلام آباد)

''میری محبتیں''

خاکہ نگاری ایک اہم اور دیگر نثری اصناف سے الگ صنفِ ادب ہے جو کم سے کم الفاظ میں کسی حقیقی شخصیت کے نمایاں اوصاف اجاگر کرنے کا فن ہے۔ خاکہ نگار کو اس کے لئے کسی ایسی شخصیت کا انتخاب ہی کرنا چاہئے جس سے اس کا قریبی تعلق ہو اور جس کی عادات واطوار، سوچ اور رویوں سے وہ پوری طرح آگاہ ہو اور اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ اس میں دوسروں کی دلچسپی کا کوئی پہلو موجود ہو یا خاکہ نگار دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

حیدر قریشی کے لکھے ہوئے خاکوں پر مشتمل مجموعہ ''میری محبتیں (خاکے اور یادیں)'' سات آٹھ برس پہلے معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا تھا۔اس کے پہلے حصے میں ''اول خویش'' کے عنوان سے اپنے عزیزوں کے دس اور دوسرے حصے میں بھی ''بعد درویش'' کے عنوان سے ادیبوں اور دوستوں کے اتنے ہی خاکے شامل ہیں۔ چونکہ یہ قریبی عزیزوں اور دوستوں پر لکھے ہوئے خاکے ہیں اس لئے خاکہ نگاری کی اوپر دی گئی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ سوائے دو تین خاکوں کے جیسے فیض احمد فیض کا خاکہ، جن سے حیدر قریشی کی کم ملاقاتیں ہوئیں اور بے تکلفی کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔مگر خوبی یہ ہے کہ انہوں نے نہایت دیانتداری سے جتنا تعلق تھا اتنا ہی بیان کیا ہے اور اپنے پاس سے کچھ شامل کرنے کی، جس کی بہت گنجائش تھی، کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ فیض مرحوم کو دور سے دیکھنے والوں میں سے ہیں۔ حیدر قریشی نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے خاکوں کے ساتھ یادوں کا اضافہ بھی کر دیا اس لئے اگر کوئی خاکہ فنی یا تکنیکی اعتبار سے خاکہ نگاری کی تعریف پر پورا نہیں اترتا جیسے پرانے ادبی احباب یا زندگی کا تسلسل وغیرہ جو ایک سے زیادہ لوگوں کے بارے میں سرسری معلومات فراہم کرتے ہیں تو ''یادوں'' میں ان کی گنجائش موجود ہے۔

اس سے پہلے میں اپنے دوست اور معروف شاعر اور انشائیہ نگار اکبر حمیدی کے خوبصورت خاکوں کی کتابیں ''قد آدم'' اور چھوٹی دنیا بڑے لوگ'' پڑھ چکا ہوں جو ان کے ادیب دوستوں اور عزیزوں

کے بارے میں ہیں۔ حیدر قریشی نے ''بلند قامت ادیب'' کے عنوان سے اکبر حمیدی کا خاکہ بھی لکھا اور بتایا ہے کہ ان کے ساتھ ان کی بہت سی مماثلتیں ہیں۔ بچوں کی پیدائش اور ناموں سے لے کر مختلف اصنافِ ادب سے دلچسپی اور دوستوں کے انتخاب تک مگر تین اہم باتوں میں حیدر قریشی آگے نکل گئے ہیں۔ ایک تو حیدر قریشی ہمیشہ سے مدیرانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں یعنی ان کا مزاج لڑکپن سے ایڈیٹرانہ ہے۔ جس میں انٹرنیٹ کی وجہ سے اور وسعت آ گئی ہے۔ کبھی آپ ان کی اور ان کے زیرِ اثر بہت سی انٹرنیٹ سائٹس کھول کر دیکھیں تو آپ کو اس میدان میں ان کی مہارت اور صلاحیتوں کا اندازہ ہو گا۔ ہمارے بہت سے شاعر اور ادیب دوستوں کو تو کمپیوٹر کھولنا اور ای میل بھیجنا بھی نہیں آتا مگر وہ دنیا بھر کے ادیبوں شاعروں سے رابطے میں رہتے اور امریکہ، جرمنی، پاکستان اور ترکی میں مقیم ادیب دوستوں سے انٹرنیٹ کانفرنسنگ کرتے رہتے ہیں۔ دوسرا شعبہ جس میں وہ اکبر حمیدی کے مقابلے میں آگے ہیں وہ (اللہ انہیں سلامت رکھے) بچوں کی تعداد ہے اور تیسرے وہ خانپور سے جرمنی پہنچ گئے اور نہ صرف ان کی اولاد بلکہ وہ خود بھی ذہنی اور اقتصادی طور پر ترقی کر گئے لیکن اکبر حمیدی نے اپنی ان کمیوں کو تخلیقی کاموں اور کتابوں سے پورا کیا۔ یعنی اگر ان کے بچوں کی تعداد کم ہے تو معنوی اولاد نے یہ کمی پوری کر دی ہے مگر مجھے حیدر قریشی کی بہت بڑی خوبی یہ معلوم ہوئی کہ وہ یورپ پہنچ کر بھی جہاں زندگی کے مشاغل اور دلچسپیوں کی نوعیت تبدیل ہو سکتی تھی شاعر، ادیب اور ادبی مدیر بلکہ دوستوں کے دوست رہے اور نہ صرف ''جدید ادب'' کے ذریعے بلکہ اپنے زیر اثر تمام ویب سائٹس پر اکبر حمیدی اور دیگر پرانے دوستوں کو یاد رکھا اور ان کی تحریروں اور کتابوں کو پروموٹ کرتے رہتے ہیں۔

یوں تو ان کے اکثر خاکوں کے عنوانات بہت خوب اور ہر شخصیت کے عین مطابق ہیں لیکن برگد کا پیڑ (والد)' مائے نی میں کنوں آکھاں (والدہ)' پسلی کی ٹیڑھ (بیوی)' ڈاچی والیا موڑ مہار وے (دادا جی)' اور مظلوم متشدد (نانا جی) بہت ہی موزوں تر عنوانات ہیں۔ دیگر خویشوں یعنی عزیز واقارب کے خاکوں میں' مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ' (تایا جی)، رانجھے کے ماموں (ناصر ماموں)، محبت کی نمناک خوشبو (آپی)، اجلے دل والا (چھوٹا بھائی طاہر) شامل ہیں۔ پانچوں بچے ایک ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ایک ہی مٹھی بعنوان ''زندگی کا تسلسل'' میں بند ہیں۔اسی طرح ادیبوں شاعروں میں، ہم کہ ٹھہرے اجنبی (فیض)' بلند قامت ادیب (اکبر حمیدی)' عہد ساز شخصیت (ڈاکٹر وزیر آغا)' میرافیئا غورث (طاہر احمد)' دوستی کا کمبل (سعید شباب) بہت عمدہ عنوانات ہیں۔اور اگرچہ خان پور کے پرانے ادبی احباب کو ایک ہی مضمون میں بھگتا دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ایک ایک پیراگراف میں پوری پوری تصویر اتار کر رکھ دی ہے۔

خاکہ نگاری میں عنوان بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ عام طور پر کسی شخصیت کی کلید ہوتی ہے جس سے وہ آپ پر منکشف ہوسکتی ہے۔ بعض لوگوں کی خوبیاں اور خرابیاں تو سامنے دھری ہوتی ہیں اور ہر کوئی انہیں اس حوالے سے جاننے پہچاننے لگتا ہے جیسے فیض صاحب کی ترقی پسندی اور اعلیٰ درجے کی غزل گوئی، ڈاکٹر وزیر آغا کی علم دوستی اور تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں اور میرزا ادیب کی سادہ لوحی وغیرہ لیکن بعض لوگوں کے بارے میں بہت غور کرنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ آخر انہیں کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا اور اللہ میاں کو انہیں دنیا میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی مگر اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے اور ادیب کا کام ہے کہ اسے تلاش کرے کیونکہ کوئی بھی چیز نکمی نہیں زمانے میں اور پھر ادب تو زندگی اور انسان سے محبت سکھاتا ہے اور ایک اچھا ادیب ہر انسان میں خواہ وہ کتنا ہی گرا پڑا اور مردود کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی خوبی یا معنویت تلاش کر لیتا ہے۔ جبکہ حیدر قریشی نے تو زیادہ تر انتخاب ہی ایسے لوگوں کا کیا ہے جن سے ان کا خون کا رشتہ یا کوئی دلی یا جذباتی تعلق ہے اور جنہوں نے عام طور پر بامقصد زندگی گزاری۔

ادیبوں میں اکبر حمیدی کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور میرزا ادیب کے خاکے بہت عمدہ اور بھرپور ہیں اور اگرچہ انہوں نے غلام جیلانی اصغر کے خاکے پر خود عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک ادھورا خاکہ قرار دیا ہے لیکن اختصار کے باوجود یہ خاکہ پروفیسر غلام جیلانی کے کردار اور شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے اور یہ اس قدر دلچسپ ہے کہ پہلے جملے ہی سے پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہتے ہیں:

''پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے میری پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ بھرپور جوانی گزار کے لڑکپن کی حدود میں داخل ہو چکے تھے''

میرزا ادیب واقعی بہت اچھے، محبت کرنے والے اور سادہ مزاج انسان تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی سادگی کے ساتھ وہ ایسے عمدہ افسانے کیسے لکھ لیتے تھے کیونکہ میرے خیال میں افسانہ نگار کو تھوڑا ہوشیار بلکہ چالاک ہونا چاہئے۔ حیدر قریشی نے ایک چھوٹی سی بات لکھ کر ان کی سادگی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے:

''میرزا ادیب نے چولستان کے سحر انگیز واقعات سنے تو بے حد حیران ہوئے پھر معصومیت کے ساتھ کہنے لگے کبھی موقعہ ملا تو میں آؤں گا مجھے چولستان کی سیر ضرور کرانا۔ حالانکہ اگر میرزا ادیب چاہتے تو اپنی حیرت کو اس خیال سے ہی چھپا لیتے کہ یہ نوجوان ادیب کیا سوچیں گے کہ ''صحرا نورد کے خطوط'' اور ''صحرا نورد کے رومان'' لکھ ڈالے مگر صحرا کی شکل تک نہیں دیکھی۔ سادگی اور معصومیت کے یہ انداز اب ادیبوں میں کہاں ملتے ہیں۔ اب تو ہر شخص تیز تلوار ہے اور موقعہ کی تاک میں!''

میرے خیال میں حصہ اول کے خاکے نسبتاً زیادہ پر اثر اور دلچسپ ہیں اور ان میں مصنف ہر شخصیت کی کلید دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خاکہ نگاری کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد سچائی پر استوار ہو اور اس میں فکشن کی ملاوٹ نہ ہو اور یہ بھی کہ شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ خرابیاں بھی بتائی جائیں مگر ایسے طریقے اور سلیقے سے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ اپنے عزیز و اقارب کے خاکے لکھتے ہوئے دراصل آپ اپنا خاکہ بھی لکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر اس میں مبالغہ، خود پسندی، تصنع اور فکشن شامل کریں گے تو وہ صاف نظر آ جائے گی اور آپ کی تحریر کو اپنے درجے سے گرا دے گی۔ مگر حیدر قریشی نے سچ کا دامن کہیں نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں متاثر کرنے کی قوت ہے۔ ان کے خوبصورت اندازِ تحریر نے اسے اور بھی دلنشین بنا دیا ہے۔

اولاد کے لئے باپ ایک گھنے اور سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے۔ خاقان خاور مرحوم نے کیا خوب کہا تھا: '' سارے جہاں کی دھوپ مرے گھر میں آ گئی۔ مجھ پہ تھا جس درخت کا سایہ وہ کٹ گیا''۔ اس لئے والد کے خاکے کا عنوان برگد کا پیڑ سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ حیدر قریشی اپنے برگد کے پیڑ کا تعارف اس طریقے سے کراتے ہیں کہ ان کی ظاہری و باطنی شخصیت آنکھوں میں گھوم جاتی ہے:

''ابا جی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔ 1960ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔ اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔ پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔ آج ابا جی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے''

آگے چل کر وہ ان کی بعض دوسری عادتوں اور خوبیوں کا ذکر کرتے اور بتاتے ہیں کہ دیگر بزرگوں کے برعکس انہیں موسیقی سے رغبت نہیں تھی۔ لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ لوک گیت اور صوفیانہ کلام سن کر جھومنے لگتے۔ اپنے والد کے بارے میں انہوں نے ایک اور دلچسپ اور راز کی بات بتائی ہے کہ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لے لی کی یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ پھر ان کی شادی حیدر قریشی کی والدہ سے ہوئی تو یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔ اور مطلقہ بیوی دوسری جگہ شادی کر کے بھی اولاد سے محروم رہی۔ مگر اپنے ابا کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بارے میں بھی کچھ چھپا کر نہیں رکھتے اور اپنے بچپن کے حالات بھی اسی سچائی اور دیانتداری سے بیان کرتے ہیں جو ان کے خاکوں کی اصل خوبی اور کامیابی کا راز ہے:

''یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا چنانچہ جیسے ہی موقع ملتا الاسٹک والی نیکر اور بٹن بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس

میں گھومتا رہتا۔ایک بار اسی لباس میں گلیوں میں گھومتا پھرتا بہت دور نکل گیا۔وہاں ابا جی اپنے دوست کی دکان پر کھڑے تھے۔ میں جا کر 'ابوا' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔وہ سمجھے کوئی اور بچہ ہے جوخواہ مخواہ ان سے چمٹ گیا ہے۔انہوں نے مجھے پرے دھکیل دیا مگر میں پھر لپٹ گیا۔وہ میری طرف غور سے دیکھے بغیر دھکیلتے اور میں بار بار چمٹتا رہا۔اتنے میں ان کے دوست کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔اس نے کہا ''قریشی صاحب یہ تو حیدر ہے''

اپنے والد کی عادات،مزاج اور ہر طرح کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا احوال انہوں نے خوب تفصیل سے بتایا ہے۔اور اس خوبی سے کہ وہ جانے پہچانے اور اپنے اپنے سے لگنے لگتے ہیں۔ان کی وفات کے بعد انہوں نے ایک روحانی کرامت کا ذکر بھی کیا ہے۔اور حالانکہ ان کی زندگی میں ان کی والدہ نے کبھی انہیں بزرگ تسلیم نہ کیا تھا مگر اب وہ بھی حیران تھیں۔حیدر قریشی بتاتے ہیں کہ وفات کے تیئسویں دن،رات نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جوان کے ابا جی کا ذاتی کمرہ تھا۔یہ خوشبو پہلے ان کی والدہ نے محسوس کی اور انہیں کمرے میں بلایا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں بھی گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔ میں حیدر قریشی کا یہ بیان پڑھ کر تھوڑا سا پریشان ہو گیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ میں تو انہیں نہایت عقلی، ریشنل اور سائنسی سوچ کا حامل سمجھتا تھا یہ انہوں نے کرامتوں اور معجزوں کی کیا باتیں شروع کر دی ہیں مگر جونہی میں نے آخری جملہ پڑھا،اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔لکھا تھا:۔۔۔۔۔''یہ خوشبو کیا تھی؟اتنی سی بات ہی کچھ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کر سکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کر سکتی ہے''

اپنی والدہ کا خاکہ بھی انہوں نے نہایت ڈوب کر لکھا ہے اور بعض ایسے دلچسپ واقعات کا تذکرہ کیا ہے جس سے نہ صرف والدہ کی سیرت و کردار پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کا اپنا بچپن بھی نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ایک بار انہوں نے کسی لڑکے کو گالی دیتے ہوئے سنا جو انہیں بہت پسند آئی اور انہوں نے بھی ارشاد فرما دی۔ان کی والدہ کو پتہ چلا تو ان کی خوب مرمت کی۔اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے گالی دینا بھول گئے۔ایک اور دلچسپ واقعہ انہی کی زبان سے سنئے:

''بچپن میں امی جی نے ایک دفعہ میری شرارتوں سے تنگ آ کر مجھے ابا جی کے ساتھ دکان پر بھجوا دیا۔ابا جی نے وہاں سزا کے طور پر میری ٹنڈ کرا دی۔میں خوشی سے چھلانگیں مارتا ہوا گھر آیا اور امی جی سے کہا:امی جی،امی جی میں بھی ابو کی طرح ہو گیا ہوں۔اب میں بھی ابو بن جاؤں گا اور پھر اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں گا''

مائیں تو محبت اور ممتا کے سمندر ہوتی ہی ہیں لیکن بہنیں اور بیٹیاں بھی تو محبت کی جھیلیں ہوتی

ہیں جو ہمارے جذبوں کی تہذیب و تطہیر کرتی اور ہماری وحشتوں اور وحشی پن کو کم کرتی ہیں۔انہوں نے والدہ اور بڑی بہن کے بہت اچھے خاکے لکھے۔مگر بیٹوں بیٹیوں کے الگ خاکے نہیں لکھے تاہم سب کا تفصیل اور محبت سے ذکر ضرور کیا۔ بلکہ عزیز و اقربا کے خاکوں پر مشتمل یہ پوری کتاب رضوانہ اور درثمین بیٹیوں کے نام کر دی اور ایک چھوٹی سی نظم (ماہیا) کے ذریعے کیا خوبصورت انتساب اور اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔بیٹیوں کو ہم چڑیاں تو کہتے ہی ہیں جنہوں نے ایک روز بابل کی چھتری سے اڑ جانا ہوتا ہے مگر حیدر قریشی نے کیا خوب کہا:

: مری چڑیوں کی جوڑی ہے/اک پہلوٹھی کی/اک پیٹ کھروڑی ہے

اور اگر مائیں سمندر اور بیٹیاں جھیلیں ہوتی ہیں تو بیٹے بھی تو دریا ہوتے ہیں جو ہمارے حال اور مستقبل کی زمینوں کو سیراب کرتے،آباد اور ہرا بھرا رکھتے ہیں۔ بیٹوں کے بارے میں بھی کیا خوب کہا ہے: دریا کی روانی ہے/اب میرے بیٹوں میں/مری گزری جوانی ہے

ان کے دادا جی کا خاکہ پڑھتے ہوئے ان کی پوری شخصیت،ان کا عہد،لوگوں کی سادگی اور اعتقادات سب کچھ زندہ ہو جاتا ہے۔لیکن ایک بار ان کے دادا جی سچ مچ مر کر زندہ ہو گئے تھے۔ ہوا یوں کہ ان کے دادا جی معمولی سے بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے۔گھر میں عزیز و اقارب جمع ہو گئے۔دادا جی کو غسل دے دیا گیا مگر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔وفات کی خبر سن کر آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔کچھ چیختے چلاتے گھر سے نکل بھاگے،ایک دو عزیز دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔دادا جی اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ دوسری گلی سے ان کے ہم نام اللہ رکھا کمہار کا پتہ کراؤ۔وہاں سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی فوت ہو گیا ہے۔ یہ سب دراصل ناموں کے مغالطے سے ہوا تھا۔موت کے فرشتوں کو عالمِ بالا میں جا کر اپنی غلطی کا علم ہوا تو وہ ان کے دادا جی اللہ رکھا قریشی کو پھر اس دنیا میں واپس چھوڑ گئے اور اسی وقت اللہ رکھا کمہار کو لے گئے۔حیدر قریشی اپنے بزرگوں کی کسی بات کو جھٹلاتے یا رد تو نہیں کرتے مگر اس ساری صورتِ حال پہ مختصر سا تبصرہ کر دیتے ہیں جس سے ان کی سوچ اور موقف کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہتے ہیں:''اس قصے کا اصل بھید کیا تھا؟ یہ تو شاید کوہِ ندا کے دوسری سمت جا کر ہی معلوم ہو سکے۔مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید کپڑوں والے سارے فرشتے سرائیکی زبان بول رہے تھے۔ظاہر ہے انہیں علم تھا کہ ہمارے دادا جی صرف سرائیکی زبان ہی جانتے ہیں''

ان کے دادا جی تو ایک سادہ اور کسی قدر درویش منش انسان تھے۔کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے ایک روز ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا ایک سائل آ گیا تو اسے اپنی قمیص اتار کر دے دی۔لیکن اس کے برعکس نانا جی زبردست شخصیت کے مالک تھے۔اور ''مظلوم متشدد'' کا عنوان ان کی شخصیت

کوکوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ان کی تشدد پسندی کی وجوہات بھی بتاتے ہیں کہ نوعمری میں انہوں نے اپنا مسلک تبدیل کرلیا تھا جس کی وجہ سے ان کے بڑے بھائیوں نے ان پر بے پناہ تشدد کیا تھا جس کے ردعمل میں ان کا مزاج بھی متشددانہ ہوگیا۔ یوں بھی ہر سیلف میڈ انسان تھوڑا بہت متشدد ہوتا ہے مگران میں حسِ مزاح بھی تھی اور آخری عمر میں مزاج میں نرمی آ گئی تھی۔ وہ حکمت بھی کرتے تھے اورانہوں نے اپنی دوائیوں کے نام بھی خود ہی بنا رکھے تھے مثلاً قبض کشا گولیوں کا نام تھا ''پیٹ کا جھاڑو''۔ اسی طرح مردانہ کمزوری کے ایک نسخے کا نام ایٹم بم تھا اور دوسرے نسخے کا نام تھا ہائیڈروجن بم عرف مردہ کو زندہ کرنا۔ حیدر قریشی نے خلقِ خدا کی بھلائی کے لئے ان کا ایک نسخہ جوں کا توں درج بھی کر دیا ہے۔ مگر کسی گارنٹی کے بغیر:

''مستگی رومی ایک تولہ، دودھ برگد ایک تولہ، شنگرف رومی ایک ماشہ، انڈے کی زردی ایک عدد، افیون تین ماشے، سم الفار ایک ماشہ، تمام چیزوں کو کونڈی میں ڈال کر خوب رگڑیں۔ چنے کے برابر گولی بنائیں۔ ایک گولی کے ساتھ ایک چھٹانک دیسی گھی یا آدھ کلو دودھ لیں۔ فراغت کے لئے نمک چاٹنا ضروری ہے۔ اس نسخے کو آزمانے والے اپنی ذمہ داری پر آزمائیں البتہ گولیاں مفید ثابت ہوں تو مجھے بھی پندرہ بیس گولیاں ضرور بھیج دیں''

حیدر قریشی اپنے نانا جی کے بارے میں اور بہت سے دلچسپ واقعات سناتے ہیں:

☆ نانا جی نہانے سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ صرف عید کی عید نہاتے۔ ایک دفعہ کہنے لگے'' نلکا چلاؤ میں نے وضو کرنا ہے۔ نانا جی نے اس وقت صرف چادر اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ میں نے نلکا چلانا روک کر کہا'' نانا جی نہا کیوں نہیں لیتے؟'' مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے:'' بیٹے جب سے تمہاری نانی مری ہے مجھے نہانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ چلو تم نلکا چلاؤ اور وضو کراؤ''

☆ ایک بار شرط لگائی تو دس کلو گوشت کھا گئے اور ایک دفعہ گنے کے رس کی پوری بالٹی پی گئے۔

☆ کبھی ہم پوچھتے کہ نانا جی آپ کہاں تک پڑھے ہیں؟ پنجابی لہجے میں اس طرح کہتے

ایویں پاس ہوں کہ لگتا کہہ رہے ہیں ایم۔ اے پاس ہوں

حیدر قریشی کی زیرک نگاہی بے معنویت میں بھی معنویت دریافت کر لیتی ہے جیسے انہوں نے اپنے تایا جی کی زندگی کے معنی تلاش کر لئے جو دنیاوی طور پر ایک طرح سے ناکام زندگی گزار کر بے اولاد فوت ہوئے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں مگر دونوں ناکام ہوگئیں۔ پہلی کے ساتھ وہ زیادتیاں کرتے رہے دوسری نے ان کے ساتھ زیادتی کی اور ان کے راستے الگ ہوگئے۔ ہر سادہ لوح اور نیک دل شخص کی طرح آپ بھی ''لائی لگ'' تھے اور آپ کو مٹی سے اتنی محبت تھی کہ گھر اور گھر سے باہر کچی زمین پر آلتی پالتی

مار کے بیٹھتے بلکہ بعض اوقات اسی طرح زمین پر دراز بھی ہوجاتے۔ مجھے ان کا خاکہ پڑھ کر ان کی سادگی پر بہت پیار آیا۔ شاید اس لئے کہ میرے اپنے تایا جی بھی ایسے ہی سادہ شخص تھے اور حیدر قریشی کے بابا جی کی طرح موسیقی سے ان کو بھی بہت لگاؤ تھا۔ حیدر قریشی کے تایا جی نے اپنی جائداد اپنی زندگی ہی میں بھائی بھتیجوں کے حوالے کر دی۔ ایسے جی دار، زندہ دل، اور معصوم فطرت لوگ اب کہاں ملتے ہیں۔ آیئے بابا جی (تایا جی) سے ملتے اور حیدر قریشی سے ان کے بارے میں مزید کچھ معلوم کرتے ہیں:

☆'' ابا جی نے زندگی ایک مقالہ نگار کی طرح بسر کی تو بابا جی نے انشائیہ نگار کی طرح گزاری۔ بابا جی نے بھرپور جوانی بسر کی۔ ابا جی اور بابا جی دونوں ایک دوسرے کے نیگیٹوز تھے۔ ابا جی کے مزاج کے برعکس بابا جی خواتین کی محفلوں میں بیٹھ کر ہمیشہ خوش ہوتے۔ نماز کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ کبھی زور لگا کر فجر کی نماز پڑھا دی تو سارا دن بہانے بنا بنا کر لڑتے۔ جمعہ کا دن آتا تو صبح سویرے ہی ان کی طبیعت خراب ہوجاتی اور عید کے موقعوں پر تو احتیاطاً ایک دن پہلے ہی بیمار ہوجاتے۔ روزوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک دفعہ میں نے انہیں کہا'' بابا جی تین دن بعد رمضان شریف کے روزے شروع ہو رہے ہیں'' بابا جی میری شرارت کو بھانپ گئے۔ پورے اعتماد کے ساتھ بولے:'' اللہ کے نیک بندے روزے رکھیں گے۔ ہم تو بڑے گنہگار ہیں''

☆ ٹی وی پر نور جہاں اور مسرت نذیر کے نغمے بڑے شوق سے سنتے بلکہ دیکھتے۔ نظر کمزور ہوگئی تو ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا مگر بابا جی کے ''حسنِ نظر'' میں کمی نہیں آئی۔ ایک بار ٹی وی والے کمرے تک پہنچتے پہنچتے نور جہاں کا گانا ختم ہوگیا اور بابا جی الٹے پاؤں یوں لوٹ گئے جیسے ملکہ ترنم سے کہہ رہے ہوں

''اچھا اگلی بقرعید پر سہی''

حیدر قریشی شاعر، افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں اور ان کی یہ تینوں خصوصیات ان خاکوں میں جمع ہوگئی ہیں۔ ان میں جا بجا بہت سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور خیال انگیز افسانے بھی مل جاتے ہیں جیسے انہوں نے اپنے ماموں ناصر کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کہیں بھی ہوتے ہر سال بہار کے دنوں میں انہیں ڈسنے کے لئے ایک ناگن آیا کرتی تھی جس کے محبوب کو ان کے ملازموں نے ہلاک کر دیا تھا۔ یوں بھی اس واقعہ میں بلا کی افسانویت تھی مگر ان کے اندازِ نگارش نے اسے اور بھی دل آویز بنا دیا ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے کثرت سے شعروں کا موزوں اور برمحل استعمال کیا ہے اور ہر خاکے یا مضمون کے آغاز میں ان کا اپنا ایک شعر درج ہے۔ پھر والدہ کے خاکے میں انہوں نے ایک ساتھ تین نظمیں شامل کی ہیں۔ ایک انشائیہ نگار کے طور پر ان کے خاکوں میں بہت سے انشائی ٹکڑے موجود ہیں۔ بلکہ یہ خاکے ان کے شوخ اور شگفتہ جملوں سے ہی دلچسپ بنے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے حیدر قریشی کو شوخی اور

لطافتِ بیان کا ذوق اپنے نانا جی سے ورثے میں ملا ہے۔ان گنت شوخ اور پرلطف جملے ان کی پوری کتاب میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ان کے چند ایسے ہی شوخ اور شرارت آمیز جملے ملاحظہ کیجئے:

☆میری زندگی میں اتوار کو بڑی اہمیت حاصل ہے میری اور مبارکہ کی پیدائش اتوار کو ہوئی۔ ہمارا نکاح بھی اتوار کو ہوا۔پہلی بیٹی رضوانہ بھی اتوار کے دن پیدا ہوئی ۔ پہلا بیٹا شعیب بھی اتوار کے دن پیدا ہوا ۔آخر حکومت نے تنگ آ کر اتوار کی سرکاری چھٹی ختم کر دی اور چھٹی کے لئے جمعہ کا دن مقرر کر دیا گیا۔

☆جب میں چھ برس کا تھا اور مبارکہ دو سال کی تھی کسی تقریب میں سب جمع تھے بڑی ممانی نے لاڈ سے پوچھا کہ کس سے شادی کرو گے۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ مبارکہ کی طرف اشارہ کر دیا۔بچپن کے اس واقعہ کے حوالے سے میں نے ایک دفعہ مبارکہ سے کہا ’’بچپن کی معمولی سی غلطی کی کتنی بڑی سزا ملی ہے‘‘اس نے فوراً کہا ’’غلطی آپ کی تھی ،سزا میں بھگت رہی ہوں‘‘

☆’’بعض والدین کی اولاد نالائق ہوتی ہے۔میں وہ خوش نصیب ہوں جو پانچ اچھے بچوں کا نالائق باپ ہوں‘‘

☆دادا جی کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ابا جی نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ دادا جی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا کہ ایک سائل آ گیا۔دادا جی نے کچھ سوچا اور پھر اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے فوراً بعد کوئی اور سائل نہیں آ گیا کیونکہ اس وقت دادا جی کے جسم پر صرف ایک چادر تھی جو انہوں نے نیچے باندھی ہوئی تھی اور یہ تو طے ہے کہ انہوں نے سائل کو بہر حال خالی ہاتھ نہیں جانے دینا تھا۔

☆ایک صاحب اپنے دوست سے شکایت کر رہے تھے کہ میرا بیٹا پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دے رہا۔ زیادہ تر یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔کبھی یونیورسٹی کے لان میں،کبھی کنٹین میں،حتیٰ کہ یونیورسٹی سے باہر بھی۔اگر مجھے علم ہوتا کہ یونیورسٹی میں یہی کچھ ہوتا ہے تو اسے دوکان پر بٹھا کر بزنس میں لگا دیتا اور خود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔

ایسے ہی شوخ اور شگفتہ جملوں میں وہ بہت گہری اور فکری باتیں بھی کہہ جاتے ہیں ۔اپنے ماموں کے خاکہ میں عالمی سیاست کے حوالے سے کہتے ہیں:

☆اس وقت عالمی امن کی خرابی میں سارا قصور ان بڑے ملکوں کا ہے جو خواہ مخواہ ’ہیر کے مامے‘ بنے پھرتے ہیں جبکہ دنیا کو اس وقت خاص طور پر رانجھے کے ماموؤں کی ضرورت ہے۔یعنی ماموں ناصر جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

حیدر قریشی نے خاکہ نگاری کے فن کو محض شوخی ،شگفتگی اور تعارف وتبصرہ تک محدود نہیں

رکھا۔ان میں نہایت سنجیدہ معاملات اور دانشورانہ نکتے بھی پیدا کئے ہیں۔اپنے چھوٹے بیٹے کے بچپن کے احوال میں وہ اس کے معصومانہ تجسس کا ذکر ہوئے کہتے ہیں:

’’کوئی زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ میاں کتنا بڑا ہے، یہ جاننے کے لئے ٹیپو نے اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں جس حد تک پیچھے لے جا سکتا تھا، لے جا کر پوچھا’’ کیا اللہ میاں اتنے بڑے ہیں؟بس اسی لمحے میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے خدا کے بارے میں عقائد اور تصورات مجھ پر آئینہ ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سارے مذہبی لوگ ننھے منے معصوم بچوں کی طرح اپنی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔جس کی بانہیں جہاں تک جا سکی ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو بڑا سمجھ رکھا ہے کیونکہ اس سے زیادہ بڑائی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔تاہم اس سے مجھے تمام مذاہب کی خدا کے معاملے میں سچی جستجو اور محبت کا احساس ضرور ہوا۔ یہ الگ بات کہ اس کی ہستی کسی بھی عقیدے اور تصور سے بڑھ کر ہے‘‘

اس میں ایک تو بچے کے متجسسانہ ذہن‘ مزاج اور عادت کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اور دوسرے اس میں خدا کو سمجھنے کے بارے میں مختلف مذاہب کے لوگوں کے حوالے سے ایک گہری بات کہی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا فکری نکتہ ہے جو بہت سی بحثوں اور دلائل کے انبار پر بھاری ہے۔اس سے میرے دل میں فکری حوالے سے ان کی توقیر میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سب خصوصیات کی روشنی میں میری محبتیں‘‘ خاکوں کا ایک بہت ہی خوبصورت اور خیال انگیز مجموعہ اور خاکہ نگاری کے فن میں ایک اہم اضافہ ہے۔☆☆

آپ کی بھیجی ہوئی ’’میری محبتیں‘‘ مجھے مل گئی ہے۔یقیناً یہ کتاب کا کمال ہے کہ اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا۔اور اس وقت تک کسی اور طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہ رہا جب تک کہ وہ ختم نہ ہو گئی۔آپ کی ’’محبتیں‘‘ پڑھی تو آپ کے قلم اور مشاہدہ کا قائل ہونا پڑا۔**محمود ہاشمی** (برمنگھم،انگلینڈ)

(مکتوب مطبوعہ **حیدر قریشی کی ادبی خدمات** مرتب پروفیسر نذر خلیق ص ۲۲۰)

آپ کی کتاب ’’میری محبتیں‘‘ دیکھنی شروع کی ہے۔لگتا ہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔میرا دل چاہا کہ آپ کو بتاؤں کہ جو پڑھا ہے‘ پسند آیا۔آپ نے بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں‘ آپ کو اس کی داد ملے گی۔۔۔۔بڑی بے ساختگی ہے،روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لاجواب ہے۔۔۔۔آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھی اور زیادہ شعریت ہے۔

مقصود الٰہی شیخ (بریڈفورڈ،انگلینڈ) نذر خلیق اور وسیم انجم کی کتابوں سے دو اقتباس

فاروق شکیل (حیدر آباد، دکن)

’’میری محبتیں‘‘۔محبت بھری بیاض

محبت ایسا پھول ہے جب دلوں میں کھلتا ہے تو احساسات کو معطر کر دیتا ہے، فکر کے زاویوں کو روشن کر دیتا ہے۔محبت چاند ہے، نغمہ ہے، شعر ہے، سمندر ہے۔محبت کے ساز پر جب زندگی نغمہ سرا ہوتی ہے تو وجود مسحور ہو جاتا ہے اور جب محبتوں کی خوشبو قرطاس پر پھیلتی ہے تو ’’میری محبتیں‘‘ ہو جاتی ہیں۔یہ محبتیں دیارِ غیر کی خوبصورت نامور شخصیت حیدر قریشی کی ہیں جو اپنے وجود میں خاکوں اور یادوں کی خوشبو بکھیر رہی ہیں۔دیارِ غیر میں اردو کی آبیاری کرنے والوں میں حیدر قریشی ایک اہم نام ہے، جو نہ صرف سخن کے پھول کھلاتے ہیں بلکہ نثر کی خوشبو سے بھی اردو کی وادیوں کو مہکاتے ہیں۔’’میری محبتیں‘‘ ان کے خاکوں اور یادوں کی خوشبو بھری بیاض ہے۔حسین سرورق پر گلاب اور دوسرے پھولوں کی تصویروں ہی سے درون کتاب کی مہک آتی ہے۔اس کتاب میں حیدر قریشی کی ذات و شخصیت سے وابستہ و پیوستہ شخصیتوں کی محبتیں مسکراتی ہیں۔ترتیب فہرست میں بعنوان ’’اوّل خویش‘‘ کے تحت ماں، باپ، دادا، نانا، تایا، ماموں، بہن، چھوٹا بھائی اور ان کے اپنے بچوں پر خاکے ہیں۔دوسرا باب ’’بعد درویش‘‘ کے تحت ادبی شخصیتوں پر تحریریں ہیں جن میں میرزا ادیب، فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، عذرا اصغر، سعید شباب، محمد اعجاز اکبر، طاہر احمد اور خانپور کے احباب شامل ہیں۔

پشت ورق پر اشفاق احمد اور جوگندر پال کے تاثرات ہیں۔اشفاق احمد نے لکھا ہے:

’’ولایتی زبانوں میں ایسے اسکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے
ہیں لیکن اردو میں ’’میری محبتیں‘‘ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے‘‘

جوگندر پال رقمطراز ہیں:

’’حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔حیدر قریشی چونکہ پورا منہ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے اس لیے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے‘‘

جوگندر پال نے حیدر قریشی کے فن کی سچی عکاسی کی ہے۔کتاب کے مطالعہ نے واضح کر دیا کہ حیدر قریشی کے قلم سے محبتیں ٹپکتی ہیں اور محبتوں کی بارش میں بھیگ کر قارئین کے احساسات بھی حیدر قریشی کے پیکر میں ضم ہو جاتے ہیں، گویا قاری خود کو حیدر قریشی تصور کرنے لگتا ہے۔

حیدر قریشی کی تحریر میں مقناطیسی کیفیت ہے جو قارئین کو پیار کی ڈور سے باندھے ہوئے ان بستیوں میں لے جاتی ہے جہاں کی مٹی میں مہر و وفا کی مہک ہے اور وہ کردار ہیں جو ابا جی، امی جی، دادا جی، نانا جی، تایا جی، ماموں ناصر، آپی، مبارکہ، چھوٹے بھائی طاہر اور بچوں کی صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ان تمام سے مل کر اپنائیت کا ایسا احساس جاگتا ہے جیسے وہ سب ہمارے اپنے ہی ہیں۔حیدر قریشی کی تحریریں جہاں رس بھری لگتی ہیں وہیں تیکھا اور کھرا انداز بھی جاذبیت رکھتا ہے۔امی جی کے خاکے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں حیدر قریشی کے کمال فن کا جادو نظر آتا ہے۔

’’امی جی فوت ہوئیں تو میں ساکت ہو گیا۔آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر ساون بھادوں کی وہ برسات نہ ہوئی جو دو سال پہلے ابا جی کی وفات پر ہوئی تھی۔اس بارے میں مجھے ابھی تک ایک مجرمانہ سا احساس ہے۔کبھی سوچتا ہوں ابا جی کو امی جی کی ہم سے زیادہ ضرورت تھی۔شاید اسی لئے موسلا دھار بارش نہیں ہوئی۔کبھی خیال آتا ہے کہ میں تو امی جی کے حصے کا بھی ابا جی کی وفات پر ہی رو چکا ہوں کیونکہ امی جی تو ابا جی کی وفات کے ساتھ ہی فوت ہو گئیں تھیں۔وہ تو صرف دعاؤں کا ایک مجسمہ تھا جو ہمارے ساتھ تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔لیکن کبھی کبھی جب ماں کے سمندر وجود اور اپنے جزیرے پن کا احساس جاگتا ہے تو مجرمانہ احساس جیسے زائل ہونے لگتا ہے۔‘‘

’’بعد درویش‘‘ میں اردو کی نامور شخصیتوں اور احباب کے خاکے ہیں جن سے حیدر قریشی کی ذہنی، قلبی یا قلمی وابستگی رہی ہے۔ان خاکوں میں بھی ان کے تخلیقی جوہر چمکتے نظر آتے ہیں جو قارئین کے ذہنوں کے کینوس پر ابھر کر حیدر قریشی کی محبت بھری یادوں کے نقوش ثبت کرتے ہیں۔

بے شک ’’میری محبتیں‘‘ اردو پرستاروں کے لیے محبتوں کی حسین سوغات ہے۔☆☆

معاصر اردو ادب کی بہت سی شخصیات اپنی داخلیت زدگی کی وجہ سے اپنے عہد کے تجربہ کردہ انسانوں کے مسائل کو گرفت میں لانے سے قاصر رہی ہیں۔حیدر قریشی نے اپنی نثری اور شعری تخلیقات میں ذات اور سماج کے معاملات کو یکجا کرنے کے لئے جدید اسالیبی تنوع سے بھرپور کام لیا ہے۔ان کا ادبی کام باسی کڑھی میں ابال کی مثال نہیں ہے۔حیدر قریشی نے جدید اردو نثر کو تازہ کاری کی ایک پُرتاثیر لہر سے آشنا کیا ہے (تاثرات **ڈاکٹر سعادت سعید** بحوالہ ’’حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز‘‘ ص ۱۲۸)

سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)

کھٹی میٹھی یادیں

ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے حیدر قریشی صاحب کی ای میل موصول ہوئی جس میں یہ حکم دیا گیا کہ میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' پڑھ ڈالوں....تو بغیر کوئی وجہ معلوم کئے میں نے پڑھنا شروع کر دیا،اس لئے کہ سبق یہی ملا ہے کہ اچھی باتیں سننے اور اچھی چیزیں پڑھنے میں ذرا تاخیر نہیں کرنا چاہیئے کہ اِن سے ذہنی پراگندگی دور ہوتی ہے،اور دل و دماغ بہجت آمیز روشنی سے منور ہو جاتے ہیں چنانچہ میں کبھی بھی پڑھنے کے ایسے سنہری مواقع ضائع نہیں کرتا ہوں۔

اپنی کھٹی میٹھی یادوں کو حیدر قریشی نے عنوانات کے خوش رنگ اور مختلف پیانوں میں بھر دیا ہے کہ ادب کا کوئی پیاسا جس پیانے کی پیاس محسوس کرے پہلی سانس میں اُسی کو پی لے۔میں بھی چاہتا تو یہی تھا کہ جس ترتیب سے''کھٹی میٹھی یادیں'' کا میخانہ سجا ہے اُسی ترتیب سے میں بھی اپنی تشنگی دور کروں،لیکن میں نے مروجہ طریقہ اختیار کرنے کے بجائے سب سے پہلے آخری پیانے کو اٹھا لیا۔جس پر لکھا تھا''میری عمر کا ایک سال'' اس ایک پیانے نے تو چکرا کے رکھ دیا۔حیدر قریشی نے صرف ایک برس میں جو کام کئے وہ پڑھنے سے میری تو سانس پھول گئی، یہ آدمی ہے یا جن ہے۔میں ہفتہ عشرے میں دو چار صفحات لکھ لوں،تو سرشار سا ہو جاتا ہوں۔اور حیدر قریشی نے تو ادب کے ساتھ انٹرنیٹ اور جدید ادب کی ادارت کا بھی بوجھ اٹھا رکھا ہے اور اپنے گھر کے ایک کمرے کو بیوی کے لئے سوکن کا کمرہ بنا رکھا ہے۔

ویسے کتاب کا اور بیوی کا تعلق سوکن جیسا ہی ہوتا ہے۔لیکن کچھ لوگ ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ بیوی کو شیشے میں اتار لیتے ہیں کہ وہ اکراہِ دلی کے ساتھ سہی شوہر اور کتاب کو ساتھ ساتھ دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہے۔خواتین عام طور سے مادیت پسند.. یا مادیت پرست ہوتی ہیں۔دولت کمانے کے لئے مرد کو پردیس تو بھیج دیتی ہیں لیکن کتاب کے ساتھ اکیلا چھوڑنا گوارا نہیں کرتی ہیں۔حیدر قریشی نے خدا جانے اپنی بیگم پر کیا جادو کیا ہے جو اپنے گھر میں اُس نیک بی بی نے''سوکن'' کا کمرہ بنوا رکھا ہے اور میاں کے لئے چائے پانی بھی وہاں بھیجتی رہتی ہیں۔

''کھٹی میٹھی یادیں'' کے تعلق سے میں نے ایک بات یہ لکھی ہے کہ قریشی صاحب نے اپنی سب یادوں کو اُن کے تلخ اور شیریں ذائقے کے حساب سے مختلف پیانوں میں ڈھال رکھا ہے۔اس کا ایک فائدہ لکھنے والے کو یہ ہوتا ہے کہ وہ عنوان کے رنگ سے مطابقت رکھتی ہوئی یادوں کو کسی دوسرے پیانے میں نہیں ڈالتا۔یوں ہر پیانے کی شراب خالص ہوتی ہے۔کاک ٹیل نہیں بن جاتی۔اِن خوش رنگ پیانوں ہی کی وجہ سے یادوں کا ذائقہ کھٹا میٹھا بھی ہو گیا ہے اور ایک ساتھ پی جانے کا احتمال بھی ختم ہو گیا ہے،پھر ان ذائقوں کی وجہ سے یہ خوبی بھی پیدا ہو گئی ہے کہ ہر پیانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کو اپنی یادوں کے میخانے بھی یاد آ جاتے ہیں اور وہ حیدر قریشی کی کھٹی میٹھی یادیں پڑھتے پڑھتے اپنی تلخ و ترش یادوں کا ذائقہ بھی چکھنے لگتا ہے....جیسے میں....میرے ساتھ تو یہ ہوا کہ تقریباً ہر پیراگراف پڑھنے کے بعد ذہن کے اندھیرے میں پڑی ہوئی اپنی کوئی بھولی بسری یاد،یکا یک جگمگ کرتی ہوئی سامنے آتی رہی ہے۔لیکن اِس کے باوجود حیدر قریشی صاحب کی ایک برس کی ادبی کارگزاریوں کی روداد پڑھ کر پسینہ بھی آیا رشک بھی۔

۱۳/جنوری ۲۰۰۳ سے ۱۳/جنوری ۲۰۰۴ تک حیدر قریشی نے جہاں اور بہت سے کام سر انجام دیئے وہاں ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنی بارہ کتابوں پر مشتمل کلیات کی پروف ریڈنگ مکمل کی۔اِس مشکل کا احساس مجھے یوں ہوا کہ میں اپنی کوئی تحریر دو چار بار لکھنے کے بعد ہی اشاعت کے لئے دیتا ہوں۔پھر کسی رسالے یا کتاب میں شامل ہونے کے بعد محض پروف ریڈنگ کے لئے پڑھنا میرے بس کی بات نہیں،اور حیدر قریشی نے اپنی ایک دو کتابوں کی نہیں بلکہ پوری ایک درجن کتابوں میں شامل تمام تحریروں کی پروف ریڈنگ کی....شاباش لڑکے تو جواں مردوں سے بازی لے گیا!اس اہم کام کے علاوہ، نہ صرف حج کیا بلکہ حج کی روداد بھی تحریر کی۔۔تین غزلیں اور تین نظمیں کہیں۔۔(جبکہ چند نظمیں اور افسانے بھی لکھے اور جب وہ اپنے معیار کے مطابق نظر نہیں آئے تو اُن کو تلف کر دیا) اپنے لکھے پر ایسی تنقیدی نظر ڈالنا بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں....میر نے تو اپنے سارے دیوان محفوظ رکھے جبکہ غالب نے اپنے اردو کلام کا کڑا انتخاب کیا۔حیدر قریشی صاحب نے تخلیقی کام کے ساتھ تنقیدی کام یہ کئے کہ ساختیات اور ماہیا پر مباحث آغاز کرنے کے ساتھ چھ کتابوں پر تبصرے لکھے۔اور دو کام جو خاصے مشکل تھے وہ بھی کر ڈالے....یعنی اپنی عادت میں تبدیلی۔مثلاً کتاب یا رسالہ پڑھتے وقت اگلے صفحہ کو انگلیوں سے پکڑے رہنا کہ فوراً ہی ورق پلٹ سکیں، یہ ان کی پڑھ لینے کے علاوہ کسی کام کو التوا میں نہ ڈالنے کی عادت بھی کہی جا سکتی ہے،میرے نزدیک یہ ایک خوبی ہے جو ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات میں کم ہی پائی جاتی ہے،اور دوسری عادت جو شرمیلے پن سے متعلق ہے،جس پر ایک دوست نے ٹوکا بھی۔۔یعنی یہ آنکھ

ملا کے بات نہیں کرتے تھے۔ اِس عادت سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی آنکھ میں لحاظ اور مروت بہت ہے، اب اگر اس عادت کو اہلِ مغرب پسند نہیں کرتے، تو یہ اُن کے مزاج کی بات ہے۔ مغرب کی بے حجابانہ تہذیب کی بہت سی باتیں تو مشرقی ماحول سے لگّا ہی نہیں کھاتی ہیں۔ البتہ عادتوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حیدر قریشی نے اُن عادتوں کو چھوڑ دیا۔ یا۔ وہ اب تک ساتھ لگی ہوئی ہیں اندازہ یہی ہے کہ جدید ادب کے مدیر ہونے کے باوجود اپنی تہذیبی روایات سے وابستگی اور مشرقی تمدن تو گھٹی میں پڑا ہے۔ اس لئے وہ عادتیں اب تک ساتھ ہونگی۔

اُس ایک سال کے عرصے میں جو سب سے بڑا کام انجام دیا وہ یہ ہے کہ باونویں سال سے چھلانگ لگا کر ترپین (۵۳) برس کی عمر میں پہنچ گئے۔ (اور اب جنوری 2005 کی تیرہویں کو چوّن سال کے ہوگئے۔) عمر کی بات نکلی ہے تو یہ عرض کردوں حیدر قریشی مجھ سے سولہ سال عمر میں چھوٹے لیکن لکھنے پڑھنے، لوگوں سے مراسم قائم رکھنے اور صاحبِ تصانیف ہونے کے معاملے میں مجھ سے سولہ برس نہیں بلکہ ایک سو سولہ سال بڑے ہیں۔

کھٹی میٹھی یادیں۔ کے بارے میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ان سوانحی یادوں میں اپنے بزرگوں کے لئے احترام، ہم عمروں کے محبت اور چھوٹوں کے لئے شفقت و پیار کا اظہار نہایت خلوص کے ساتھ ملتا ہے۔ اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قریشی صاحب کو روحانیت سے بھی لگاؤ ہے۔ اپنی اس بات کے ثبوت میں ''کھٹی میٹھی یادیں'' میں سے وہ پہلا جام اٹھالیں جس پر ''بزمِ جاں'' کا لیبل لگا ہوا ہے۔

آخری بات کے طور پر یہی کہوں گا کہ رواں دواں اندازِ تحریر نے بھی ان یادوں کو پڑھنے کے قابل ایسا بنادیا ہے کہ بقول حضرتِ صبا اکبرآبادی ؎ سارے میخانے کو اک سانس میں کیسے پی لوں

اب حیدر قریشی صاحب کے تعلق سے مجھے دو باتیں اور کہنی ہیں۔ ایک اُس دھندلے سے نقش کو اجاگر کرتے ہوئے، جب اِن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اب سنہ تو یاد نہیں ہے لیکن اندازہ یہ ہے کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ کراچی آئے اور اپنے ماموں کوثر کے ساتھ افسانہ نگار فردوس حیدر سے ملنے گئے تھے۔ حیدر قریشی کی یاد اللہ ریڈیو پاکستان والے جمیل زبیری سے تھی۔ کب سے اور کہاں سے؟ یہ حیدر قریشی کو معلوم ہوگا۔ کراچی میں جمیل زبیری صاحب عالمی سروس میں ڈپٹی کنٹرولر تھے اور انھوں نے مختلف پروگراموں کے تعلق سے بہت سارے ادیبوں کو جمع کر رکھا تھا، جن میں انجم اعظمی، امراؤ طارق، زاہدہ حنا، عائشہ خان، محمد فائق کے ساتھ راقم بھی شامل تھا۔ ایک روز زبیری صاحب نے فون کیا، دن اور وقت بتانے کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ رحیم یار خاں سے حیدر قریشی آئے ہوئے ہیں، یہ نشست اُن کے اعزاز میں منعقد ہو رہی ہے۔

جمیل زبیری نے ایک انجمن ''ہمعصر'' کے نام سے قائم کی تھی جس کی ماہانہ محفلیں اُن کے گھر باقاعدگی سے منعقد ہوتی تھیں، ان محفلوں کی خصوصیت یہ تھی کی ابتدا میں دو تین افسانے پڑھے جاتے اور پھر موجود شاعروں سے اُن کا کلام سنا جاتا تھا۔ تنقید کا تکلف بالکل نہیں تھا۔ اب اگر کراچی سے باہر کا کوئی شاعر یا ادیب کراچی آیا ہوتا تو اُس کے لئے ایک خاص محفل ترتیب دے لی جاتی....ایسی ہی تقریب حیدر قریشی صاحب کے لئے بھی منعقد ہونا طے ہوئی۔ اب خاص بات یہ ہوئی کہ مقررہ دن پر جمیل زبیری صاحب کو کہیں اور جانے کی مجبوری لاحق ہوگئی، انھوں نے مجھے فون کیا اور کہا کہ اس نشست کو وہ میرے گھر منتقل کر رہے ہیں اور تمام مدعوئین کو بھی اس تبدیلی کی اطلاع دیدیں گے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے۔ صبح یہ فیصلہ ہوا اور شام کو نشست تھی۔ بہرحال سب سے پہلے میرے غریب خانے پر پہنچنے والوں میں حیدر قریشی صاحب تھے۔۔۔۔ابھی میں نے ان کی اور اپنی عمروں کا تفاوت بیان کیا ہے۔ میں ایک نوجوان کا استقبال کر کے دروازے سے نشست گاہ تک لایا....دوسرے لوگوں کی آمد سے پہلے حیدر قریشی سے کچھ باتیں ہوئیں....اُس کے بعد....پل کے نیچے سے بہت پانی بہہ گیا....

سنہ ۲۰۰۰ کا اختتام تھا یا سنہ ۲۰۰۱ کی ابتدا، مجھے دلی سے بھیجا ہوا حیدر قریشی کے افسانوں کا مجموعہ موصول ہوا۔ معلوم ہوا کہ حیدر قریشی ٹوٹے دھاگے جوڑنا جانتا ہے سنہ ۲۰۰۱ کے اکتوبر میں تقدیر مجھے کناڈا لے آئی۔ سال بھر کے بعد کراچی سے میرے افسانوں کا مجموعہ ''میں آئینہ ہوں'' شائع ہوا، جب وہ مجھے کناڈا میں موصول ہوا تو یہاں سے میں نے اپنے جن دو چار احباب کی خدمت میں ارسال کیا اُن میں حیدر قریشی بھی شامل تھے....وصولیابی کا ٹیلیفون آیا....رابطہ بحال ہوگیا۔ صرف رابطہ بحال نہیں ہوا بلکہ حیدر قریشی نے میرا تعارف ''ان پیج'' سے کرایا۔۔ جو بات بھی سمجھ میں نہیں آئی وہ ای میل سے پوچھ لی۔ یوں حیدر قریشی نے میرے لئے ایک ''استاذ'' کا مرتبہ حاصل کرلیا۔

وقت کے دریا کے ساتھ بھاگتے بھاگتے اور کچھ ہو یا نہ ہو تھکان بہت ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس تھکان کو بیماری کہتے اور جانتے ہیں اور اس کا علاج کرتے ہیں، اتفاق یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی اکثریت ہے، اقلیت جو سوچنے سمجھنے والوں کی ہے وہ کہتے ہیں ''آگے چلیں گے دم لے کر'' اور اِس وقفہ میں وہ اپنے سفر کی روداد لکھتے ہیں۔ اِس روداد کے مختلف نام ہیں، ہمارے حیدر قریشی نے اپنے ادبی سفر کی روداد کا نام ''کھٹی میٹھی یادیں'' رکھا ہے۔ یہ ''کھٹی میٹھی یادیں'' جن میں دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کے ساتھ خود کو بھی پہچاننے کا جذبہ موجود ہے۔۔ کہیں دعاؤں کی قبولیت کی صورت میں کہیں ''بے اثری'' کے انداز میں لیکن تحریر کی روانی سُرور کی ہلکی ہلکی لہروں کی طرح ایک ایک سطر میں موجود ہے۔ ثبوت کے طور پر بغیر کسی حاشیہ آرائی کے یہ چند اقتباسات دیکھئے:

میں ''کثرتِ نظّارہ'' سے ایسے رُک رُک جاتا تھا جیسے شہر کے چوراہے پر ''گواچی گاں'' کھڑی ہوتی ہے۔ پہلی بار ایک مارکیٹ میں داخل ہونا تھا۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو آٹو میٹک دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ امی جی سے سنی ہوئی ''علی بابا اور چالیس چور'' والی کہانی یاد آ گئی۔ اُس کہانی میں ''کھل جا سم سم'' کہنے سے دروازہ کھلتا تھا۔ یہاں تو مجھے ''کھل جا سم سم'' کہنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ (**بزمِ جاں**)

اپنے ہاں تو غالبؔ اُس چار گرہ کپڑے کا افسوس کرتے رہے جس کی قسمت میں عاشق کا گریباں ہونا لکھا ہوتا ہے۔ اِدھر مغرب میں اُس تین گرہ کپڑے کی قسمت پر رشک آتا ہے جو گرمیوں میں حسینانِ مغرب نے زیبِ تن کر رکھا ہوتا ہے۔ (**بزمِ جاں**)

بُوا لال خاتوں پہلی بار لاہور گئیں۔ ایک تو لاہور ریلوے اسٹیشن کی پُر شکوہ عمارت' پھر ہجومِ خلق۔ اور اس ہجوم میں سُرخ وردی میں ملبوس قلیوں کی فوج ظفر موج۔ اوپر سے قلیوں کا 'فرطِ محبت' سے سامان اُٹھانے میں سبقت لے جانے کی کوشش' اور اس کوشش میں سامان کی کھینچا تانی۔۔۔ بُوا لال خاتوں نے سمجھا ڈاکوؤں نے ہلّہ بول دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ کا شور مچا دیا۔

(ددھیال کے رشتہ دار)

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم لوگ بے حد بھیانک غربت کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن آ رہے تھے اور میرے پَیروں میں ہوائی چپّل تھی۔ تب خالہ حبیبہ نے اپنے پرانے ''کوٹ شوز'' مجھے دے دیئے۔ خالہ حبیبہ کے پاؤں ہمیشہ سے چھوٹے رہے ہیں۔ اسی لئے مجھے وہ ''کوٹ شوز'' پورے آ گئے اور میری سردیاں آرام سے گزر گئیں۔ اسکول کے بعض لڑکوں نے میرا مذاق بھی اڑایا لیکن اس مذاق کی تکلیف سردیوں میں ہوائی چپل پہننے کی تکلیف سے کم تھی۔ اس لئے اسے برداشت کرلیا۔ برداشت نہ بھی کرتا تو کیا کر لیتا۔ (**پڑھنے سے پڑھانے تک**)

دسویں کا رزلٹ آنے سے پہلے میں من ہی من میں ارادہ بنایا کرتا تھا کہ نوکری کے ساتھ پڑھائی کروں گا۔ یا تو گریجوایشن کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا اور ایک دن ڈپٹی کمشنر بنوں گا' یا پھر وٹرنری ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ ڈپٹی کمشنر بننے کی آرزو تو پھر بھی ممکنات میں سے تھی لیکن وٹرنری ڈاکٹر بننا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ دسویں میں میرے مضامین آرٹس گروپ کے تھے۔ اس میں جنرل سائنس کا مضمون بھی میں نے مر مر کر پاس کیا تھا۔ وٹرنری ڈاکٹر بننے کے لئے تو ایف ایس سی کرنا پہلی سیڑھی تھی جو میرے لئے بذریعہ تانگہ جرمنی جانے سے زیادہ مشکل تھی۔ بہرحال شوگر مل کی نوکری کے پہلے دن جب مجھے لیبارٹری کی کھڑکیوں کے شیشوں اور فرش کی صفائی کرنا پڑی تو میرے اندر کے ڈپٹی کمشنر اور وٹرنری ڈاکٹر دونوں کی

موت واقع ہوگئی۔ صفائی کرتے ہوئے' اپنے دوسرے ساتھیوں سے منہ چھُپا کر میں ان دونوں کی موت پر باقاعدہ آنسوؤں سے روتا رہا۔ (**بندۂ مزدور کی اوقات**)

جب ہمارے حالات قدرے بہتر ہونے لگے تو باباجی ایک سیکنڈ ہینڈ بلکہ تھرڈ یا فورتھ ہینڈ ریڈیو ٹرانزسٹر لے آئے۔ ہر سیٹ کی طرح اس سیٹ پر بھی دائیں بائیں KC--MC-MW-SW کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ میڈیم ویو یا شارٹ ویو پروگراموں کی فریکوئنسی تلاش کرنے کے لئے ان سے راہنمائی ملتی ہے۔ اکبر تب چھٹی جماعت میں تھا۔ نئی نئی اے بی سی سیکھی تھی۔ چنانچہ وہ انہیں بڑی روانی سے ساتھ مئو، سئو، کک، مک پڑھتا تھا۔ ریڈیو کے پیچھے کا کور جب چاہتے کھول لیتے بلکہ اکثر کھلا ہی رکھتے۔ پرزوں کے اصل نام تو خدا جانے کیا ہوں گے۔ دیسی حساب سے بیشتر پرزوں کے نام ہمیں یاد ہو گئے تھے۔ کسی تار کا ٹانکا ٹوٹ جاتا تو باباجی خود ہی ٹانکا لگا لیتے تھے، ایک بار ریڈیو کے سپیکر سے منسلک تار کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔ باباجی گھر پر نہیں تھے۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ میں نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے پروگرام ''یک رنگ'' سننا تھا۔ یہ پروگرام مجھے ویسے بھی اچھا لگتا تھا لیکن اس دن یک رنگ کا الوداعی پروگرام تھا۔ یک رنگ۔۔۔ یک رنگ کے نام تھا۔ تب میں نے تار کا ننگا حصہ اسپیکر کی متعلقہ جگہ پر انگلی کے ساتھ مسلسل چپکائے رکھا اور یوں وہ سارا پروگرام سنا۔ (**گراموفون سے سی ڈی تک**)

ڈاکٹر وزیر آغا ایک بار اپنے صاحبزادے سلیم آغا کے ساتھ لندن کی سیاحت کیلئے گئے تھے۔ ان کی واپسی پر میں اور ڈاکٹر پرویز پروازی ان سے ملنے کے لئے ان کے گاؤں وزیر کوٹ گئے۔ وزیر آغا اور سلیم لندن کے احوال بتا رہے تھے پرویز پروازی، ڈاکٹر وزیر آغا کے ایج گروپ کے ہیں، ان کے دوست بھی ہیں، سو سلیم آغا ان کا بزرگوں کی طرح احترام کرتے ہیں یکا یک پرویز پروازی نے سلیم آغا سے ایک شریر سا سوال پوچھ لیا۔۔ سنا ہے کہ اصل انگلش نسل خواتین کا Bottom بندر کے Bottom جیسا ہوتا ہے۔ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟ سلیم آغا کا مزاج بھی اس انداز کی باتوں والا نہیں ہے، چنانچہ اس اچانک اور بے باک سوال پر وہ شرما کر رہ گئے۔ لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی ہی برجستہ معصومیت کے ساتھ کہا: جس نے بندر کا Bottom ہی کبھی نہیں دیکھا، وہ اس بارے میں کیا بتا سکتا ہے۔

(اخلاقی قدریں اور ویاگرا)

اپنے ذاتی تجربہ نہیں' پیہم تجربات کی بنیاد پر میں دعا کا ایک مسنون نسخہ سارے دوستوں کے لئے یہاں بیان کئے دیتا ہوں۔ جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد سورۃ یاسین اور سورۃ صافات پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا لیں اور خدا سے کوئی ایک (صرف ایک) دلی مُراد مانگیں۔ جائز مُراد ہونے کی صورت میں ایک دو جمعوں میں ہی مُراد پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی بہت ہی مشکل قسم کا کام ہو تو اس کی مشکل کے

مطابق وقت زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔لیکن ثابت قدمی سے اور باقاعدگی سے یہ وظیفہ جاری رکھنا ضروری ہے۔(**دعائیں اور قسمت**)

بچپن اورلڑکپن میں میراسب سے پسندیدہ کھیل ''گُلّی ڈنڈا'' تھا۔گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھی یہ کھیل کھیلنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔تھوڑی سی کرکٹ بھی کھیلے تھے لیکن ہماری کرکٹ کے قواعد ہمارے اپنے تھے۔کپڑے کی کترنوں کو مِلا جُلا کر گیند تیار کی جاتی۔اسے پنجابی میں ''کھدُّو'' کہتے ہیں۔تختی سے بیٹ کا کام لیتے۔وکٹوں کی جگہ اینٹیں سجائی جاتیں تاکہ وکٹ گرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔بیٹس مین شاٹ کھیلنے کے بعد جتنی چاہے رنز بنا سکتا تھا۔''کھدُّو'' کبھی قریبی جھاڑیوں میں گُم ہو جاتا تو بیٹس مین کے وارے نیارے ہو جاتے۔ایسے ہی ایک موقعہ پر میں نے مسلسل پندرہ رنز بنائے تھے۔پھر تھک گیا تھا اس لئے مزید رنز نہیں بنائے۔وگرنہ ایک شاٹ پر سنچری ہو سکتی تھی کیونکہ گیند جھاڑیوں سے ملی ہی نہیں تھی۔

(**شوخیاں،بچپنا**)

اندھیرا ہو یا اجالا۔۔۔۔میں تنہائی سے ڈرتا اور گھبراتا تھا۔ایک عمر کے بعد معلوم ہوا کہ گیان کی روشنی اسی تنہائی سے نصیب ہوتی ہے۔پُر خوف اور گناہ کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد یہ منزل نصیب ہوتی ہے۔میں بھی گیان کی منزل کا راہی ہوں لیکن ابھی رستے میں ہوں اور شاید جان بُوجھ کر رستے میں ہوں کہ رستوں کا'سفر کا اور سفر کی چھوٹی چھوٹی منزلوں کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔(**علتیں،علالتیں**)

مجھے تو بالکل ہی بھول گیا تھا لیکن اب نذر خلیق صاحب نے یاد دلایا ہے کہ میں نے ایک بار ایک فلمی رسالہ ''سنگیت'' خانپور سے شروع کیا تھا۔یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔تب میں نے جن دوستوں کی ٹیم بنا کر یہ فلمی رسالہ شروع کیا ان میں نذر خلیق بھی شامل تھے۔اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا۔۱۹۷۸ء میں پھر میں نے خانپور سے ''جدید ادب'' جاری کیا۔اس کی ٹیم میں صفدر صدیق رضی اور فرحت نواز (اب رحیم یار خان میں انگلش کی پروفیسر ہیں) موثر پارٹنر تھے۔رضی صرف دو،ڈھائی سال تک دوستی نبھا سکے۔اور پھر وہ ''جدید ادب'' کی ادارت میں شامل نہ رہے۔البتہ فرحت نواز رسالہ کی ادارت میں آخر دَم تک شامل رہیں۔(**ابتدائی ادبی زمانہ**)

مجھے تو چھوٹے بڑے لگے ہوئے ہر لیبل کی شراب میں نشہ اپنی مختلف کیفیات کے ساتھ محسوس ہوا ہے۔اپنی اس تحریر کی تفسیر،اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لئے حضرت صبا کی دو ابیات کا سہارا لے رہا ہوں کہ جہاں نثر کے طویل جملے درکار ہوں وہاں شاعری کا ایجاز و اختصار ہی کام آتا ہے۔۔پھر یہ بھی ہے کہ حیدر قریشی نثر نگار ہونے کے ساتھ ایک کامیاب شاعر بھی ہیں،سو اِن ابیات کے ذریعہ اُن کی شاعری میں چھپی ہوئی کھٹی میٹھی یادیں بھی نمایاں ہو جائیں گی۔

لفظ مے بھی ہے،سبو بھی،جام بھی،مِینا بھی ہے   لفظ ہی روحِ عنب ہے، ساغرِ صہبا بھی ہے
لفظ کی عینک لگا کر ایک دنیا دیکھ لی   لفظ کے ذرّے میں ہم نے روحِ صحرا دیکھ لی

حیدر قریشی نے بھی اپنی یادوں کو کھٹا اور میٹھا کرنے کے لئے الفاظ کی مٹھاس اور کھٹاس استعمال کی ہے لیکن مجھے اِن کے الفاظ میں غیروں کے لئے اور اُن لوگوں کے لئے بھی خاص طور سے جنھوں اِن کے ساتھ مناسب اور اچھا سلوک نہیں کیا تلخی اور ترشی کم ہی محسوس ہوئی ہے۔۔۔۔شاید لفظوں کا احترام کرنے والوں کا یہی شیوہ ہے۔

☆☆

(**نوٹ ازادارہ**: سلطان جمیل نسیم صاحب کی طرف سے یہ مضمون تیرہ اگست ۲۰۰۵ء کو موصول ہوا تھا)

ریفرنڈم سے کچھ روز پہلے میرے پاس حیدر قریشی کا خط آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں سولہ دسمبر کو کراچی آ رہا ہوں۔حیدر قریشی ملک کے جانے پہچانے ادیب ہیں اور اُس زمانے میں رحیم یار خان میں سکونت پذیر تھے وہ جدید ادب کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا کرتے تھے۔اتنے چھوٹے اور عام دھارے سے الگ شہر میں بیٹھ کر ادب کی آبیاری کرنا اور نہایت معیاری رسالہ نکالنا انہی کا کام تھا۔ان سے کچھ عرصہ سے میری خط وکتابت تھی۔ان کے خطوط سے ہی میں نے ان کے خلوص کا اندازہ لگا لیا تھا انہیں لکھا بھی تھا کہ وہ کراچی آئیں اور مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشیں مگر انہوں نے اپنے آنے کی ایک ایسی تاریخ لکھی جو شاید میری زندگی کے سب سے مصروف دن تھے۔میں نے انہیں خط لکھ دیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی آمد کی تاریخ بدل لیں۔مگر شاید انہیں کراچی میں انہی تاریخوں میں کچھ اور کام بھی تھا اور وہ تاریخ نہیں بدل سکے۔

میں اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا ہر منٹ پر ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔پروڈیوسر دوڑ رہے تھے اسی دوران میں میری نظر اٹھی تو دیکھا کہ ایک صاحب جنہیں میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔فون رکھ کر میں ان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا''جی فرمایئے''وہ بڑی خوبصورتی سے مسکرائے اور آہستہ سے بولے''حیدر قریشی''میں بالکل سٹ پٹا گیا۔کھڑے ہو کر ان سے گلے ملا۔ان کے لئے چائے منگوائی۔وہ چائے پیتے رہے میں کام میں مشغول رہا۔سلطان جمیل نسیم کو اپنی مصروفیت کا حال بتا کر ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھر پر حیدر قریشی کے ساتھ ایک ادبی نشست کا بندوبست کر لیں اور ٹیلیفون کر کے کچھ دوستوں کو مدعو کر لیں انہوں نے میری لاج رکھ لی جب مغرب ہوگئی اور کام کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں سلطان جمیل کے گھر کا ٹیلیفون نمبر اپنے پروڈیوسر کو دے کر اور حیدر قریشی کو ساتھ لے کر ان کے گھر چلا گیا۔'' (**یاد خزانہ** تصنیف **جمیل زبیری** ص۳۴۳۔۳۴۴)

پروفیسر اکبر حمیدی (اسلام آباد)

حیدر قریشی سوئے حجاز

حیدر قریشی میرا اتنا قدیم اور قریبی دوست ہے کہ مَیں اس کے بارے میں ہر بات حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں۔مَیں جانتا ہوں کہ وہ جس طرف بھی رُخ کرتا ہے پورے خلوص۔نیک نیتی اور پوری قوت سے کرتا ہے اور اُس رُخ کے تمام رُخ دیکھے بغیر کسی اور طرف رُخ نہیں کرتا۔اس نے تعلیم کی طرف رُخ کیا تو اردو ادبیات میں ماسٹر کیے بغیر نہ چھوڑا۔خانپور سے نکلنے کا ''رُخ'' کیا تو پھر وہاں ٹھہرنے کو کبھی تیار نہ ہوا اور پاکستان کے مختلف شہروں کی طرف رُخ کرتا ہوا اور پھر رُخ بدلتا ہوا......آخر جرمنی کا رُخ کیا اور وہاں پہنچے بغیر رختِ سفر نہ اُتارا۔ادب کی طرف رُخ کیا تو ادب کی متعدد اصناف میں پھول کھلاتا ہوا...... ماہیا کی طرف آیا تو تحقیق وتخلیق کے دریا بہادیئے اور ماہیا کی تاریخ میں شاید سب سے نمایاں کام کر کے دکھایا۔رسالہ ''جدید ادب'' کا آغاز کیا تو اپنے محدود وسائل کے باوجود نہ صرف ''جدید ادب'' کو عالمی سطح پر شائع کیا بلکہ بلا قیمت اہل قلم کو اور قارئینِ ادب کو پیش کیا۔یہ ایک غیر معمولی اور واحد مثال ہے کہ اتنا اعلیٰ درجے کا ادبی رسالہ بلا قیمت دستیاب ہے۔

جرمنی جا کر اس کے مزاج کے کئی اور رُخ بھی سامنے آئے۔مَیں جانتا ہوں مذہب سے اُسے شروع سے ہی مخلصانہ وابستگی رہی ہے اور جرمنی جا کر تو یہ وابستگی اور بھی کُھل کر سامنے آئی۔انہی دنوں اس کی طبیعت کا ایک نیا رنگ تو نہیں......مگر ایک قدیمی اور بنیادی رنگ نئے رُخ سے سفر نامۂ حجاز کی شکل میں ''سوئے حجاز'' کے نام سے سامنے آیا۔یہ سفر نامہ سات عمروں اور ایک حجِ بیت اللہ کے مبارک سفروں کی داستان ہے۔جسے نہایت عقیدت اور والہانہ انداز میں دل کی ہی نہیں......روح کی گہرائیوں سے لکھا گیا ہے۔یہ سفر نامہ پڑھ کر مجھے مولانا حالؔی کا یہ شعر یاد آ گیا۔

حاجیو ہم کو ہے گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض

''سوئے حجاز'' کے سفرنامے پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گھر والا اپنے محراب وستوں سمیت حیدر قریشی کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہے۔یہ ایک سفر نامہ سات عمروں اور ایک حج

کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ہر سفر جہاں مصنف کی دلی کیفیتوں کی آئینہ داری کرتا ہے وہاں حجاز کے مقاماتِ مقدسہ کی تاریخ بھی بیان کرتا چلا جاتا ہے۔کتاب مکمل کرنے کے بعد مَیں نے محسوس کیا جیسے مَیں نے بھی حیدر قریشی کے ہمراہ ان مقدماتِ مقدسہ کی زیارت کرلی ہے اور ان مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی برکات سے اسی طرح فیض یاب ہوا ہوں جیسے حیدر قریشی۔ظاہر ہے یہ تمام تاثر حیدر قریشی کی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس تحریر کا نتیجہ ہے جو اس کتاب کے ہر صفحے پر قیمتی موتیوں کی طرح پروئی گئی ہے۔مجھے حیدر قریشی کے طبعی اخلاص سے ایسی ہی تحریر کی توقع تھی۔میری ان معروضات کی تائید حیدر قریشی کے لکھے ہوئے ابتدائیے سے ہی ہو جاتی ہے۔ملاحظہ ہو:

> ''میرا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا کہ مَیں کوئی سفر نامہ لکھوں گا۔مَیں اس سفر کو اپنی ذات اور اپنے احباب تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ سفر میرے لیے صرف ایک سفر اور مذہبی فریضے کی ادائیگی نہ رہا۔مَیں نے اپنے جسم کے ساتھ اپنے دل، اپنے ذہن اور اپنی روح کو پے در پے انوکھے تجربوں سے گزرتے دیکھا۔مَیں نے جسمانی طور پر سفر کرنے کے ساتھ فکری اور روحانی طور پر بھی سفر کیا......پھر اس مختلف الجہات سفر کو کسی ایک نقطے پر یک جا ہوتے بھی محسوس کیا۔سو یہ اس روحانی تجربے کی شدت تھی جس نے مجھے یہ سفر نامہ لکھنے پر مجبور کیا۔'' (صفحہ ۷)

''روحانی تجربے کی شدت'' کی جھلکیاں پوری کتاب میں بار بار اپنی چھب دکھاتی ہیں۔ایک جھلک آغاز میں ہی دکھائی دیتی ہے جس سے حیدر قریشی کی والہانہ عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔دیکھیے:

> ''روانگی سے پہلے میرے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ مکہ میں جلالی شان کا سامنا ہوگا۔وہاں شاید مَیں زیادہ دیر تک ٹِک نہیں پاؤں گا اور مدینہ کی جمالی شان میں زیادہ مزہ آئے گا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مدینہ کی جمالی شان میں بھی بہت مزہ آیا لیکن کعبہ شریف نے تو جیسے مجھے باندھ لیا تھا محبت کی، عقیدت کی عجیب سی ڈور تھی۔'' (ص ۱۰)

حیدر قریشی کے اس تجربے کا ذکر مختلف الفاظ میں اور مختلف رنگوں میں مَیں نے اور حجاجِ کرام سے بھی سنا ہے۔جس میں یہ کہا گیا کہ کعبۃ اللہ کی پہلی جھلک انسان کو مبہوت کر دیتی ہے۔میرے خیال میں یہ جلالِ خداوندی کی ایک جھلک ہے جسے سنبھالنا انسانی حواس کے بس میں نہیں۔

حیدر قریشی کی دلی کیفیت کا ایک اور منظر دیکھیے:

’’مجھے درِکعبہ کے وا ہونے کا ظاہری طور پر کوئی انتظار نہیں تھا کہ میرے باطن میں کعبہ کا دروازہ آہستہ آہستہ وا ہونے لگا تھا۔(ص۳۱)

ایک اور روحانی تجربہ دیکھیے:

’’یکا یک مجھ پر منکشف ہوا کہ...... یہ سامنے والی دیوار تو صرف ظاہری پردہ ہے۔ وگرنہ مَیں جو حطیم میں بیٹھا ہوا ہوں۔ درحقیقت خانۂ کعبہ کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ عجیب لذت آفریں اسرار تھا کہ مَیں بیک وقت کعبہ کے اندر بھی تھا اور باہر بھی......اس انوکھے تجربے نے مجھے احساس دلایا کہ ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا حصہ ہے۔لیکن پھر اس بھید کا ایک اور مرحلہ بھی مجھ پر منکشف ہوا۔‘‘

کچھ مزید کیفیات:

’’گویا تھوڑے فاصلے سے کعبہ کے گرد چکر لگا کر دیکھیں تو جلووں کی کثرت ہی کثرت ہے لیکن یہ کثرت وحدت کی علمبردار ہے۔‘‘(ص۵۵)

’’ویسے سچی بات یہ ہے کہ کل کے تجربے کے باعث مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا تھا۔ آج تینوں شیطانوں کو پتھر مارنے ہیں۔ پتہ نہیں وہاں سے زندہ واپسی ہوتی ہے یا نہیں۔‘‘(ص۱۲۲)

ان تمام عمروں اور حج کے سفروں میں حیدر قریشی اکیلے نہیں تھے بلکہ ان کی بیگم بھی شریک سفر تھیں اور قدرتی بات ہے اتنے پُر ہجوم سفر میں ایسے حالات میں کچھ مسائل بھی پیش آتے ہیں جن میں سے کچھ اپنی فروگذاشتوں کے باعث ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بڑے اجتماع کے باعث اور کچھ وہاں کی انتظامی خرابیوں کے باعث۔ کچھ باتیں اس سفرنامے میں مجھے بہت نمایاں دکھائی دیں جن کا مختصر اظہار درج ذیل ہے:

1۔ یہ سفرنامے حیدر قریشی کے ظاہری ہی نہیں باطنی اور روحانی سفرنامے بھی ہیں۔

2۔ ان سفرناموں میں ان کیفیات کا والہانہ اظہار ہے جو اس دوران حیدر قریشی صاحب کو محسوس ہوتی رہیں۔

3۔ ان سفرناموں میں ان مقامات کے تاریخی پس منظر بھی بیان کیے گئے ہیں جو مصنف کے مشاہدے میں آئے یا جہاں جہاں سے وہ عمرہ اور حج کی ادائیگی کے دوران گزرتے رہے۔ یہ تاریخی پس منظر محض مذہبی نقطۂ نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ تاریخی اور جغرافیائی حوالے بھی بنتے دکھائی دیتے ہیں جن کی اس لیے بھی خاص اہمیت ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں وہ بھی علمی سطح پر ان معلومات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یوں یہ

سفرنامہ محض مذہبی حیثیت ہی نہیں رکھتا جو ہمارے نزدیک نہایت قابلِ قدر ہے بلکہ ایک تاریخی اور علمی حیثیت بھی رکھتا ہے جو ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو مذہبِ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے جنہیں مذہب سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

4۔ اس سفرنامے میں ان مشکلات کا بھی ذکر ہے جو دورانِ حج یا عمرہ کے دوران حجاج کرام کو یا زائرین کو پیش آتی ہیں یا پیش آ سکتی ہیں۔ اس سفرنامے کے ذریعے وہ ان متوقع مشکلات کی پیش بندی کا اہتمام بھی کر سکتے ہیں۔

5۔اس سفرنامے میں مقامی انتظامیہ کی ان غفلتوں کا بھی ذکر ہے جن کے باعث زائرین کو مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ان کمپنیوں کے رویّوں کا بھی ذکر ملتا ہے جنہیں دورانِ حج مختلف طرح کے کام تفویض کیے جاتے ہیں اس سفرنامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض کام خوش اسلوبی سے بھی سرانجام دیئے جاتے ہیں اور بعض غفلت کے باعث حجاج کرام کی مشکلات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

6۔ اس سفرنامے سے زائرین کو رہنمائی بھی ملتی ہے کہ ایسا سفر آغاز کرنے سے قبل انہیں کن کن باتوں کو اور کن کن التزامات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ یوں یہ سفرنامہ ایک مخصوص افادیت کا حامل بن جاتا ہے جس کا مطالعہ زائرین کے لیے بیحد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

7۔ تاریخی اعتبار سے یہ سفرنامہ معلومات کا خزانہ ہے جس کے گہرے مطالعے سے وہاں کے اہم مقامات کے بارے میں قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

8۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مقدس مقامات اور ماحول میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان سے بخوبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں بعض تبدیلیاں تکلیف دہ بھی ہیں۔

9۔ یہ سفرنامہ ایک روحانی سیر ہے مگر اسلوب اور ناقدانہ نظر ایک باشعور ادیب کے ہیں۔ یہ ادبی زبان میں لکھا ہوا روحانی سفرنامہ ہے جس میں وہاں کی انتظامی خامیوں پر تنقید بھی کی گئی ہے جو حجاج کرام کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔

10۔اس سفرنامے میں موضوعات کی رنگارنگی اور اندازِ بیان کا بہت لطف شامل ہیں۔

11۔ یہ سفرنامہ اپنے اندر جہاں تاریخی حقائق رکھتا ہے وہاں جذبوں کے ایسے مناظر بھی ملتے ہیں جو پڑھنے والے کو اپنی رو میں بہا لے جاتے ہیں اور پڑھنے والا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ خود بھی حیدر قریشی کے ساتھ اس مبارک سفر میں شریک ہے۔

12۔ یہ سفرنامہ اپنے صفحات کے لحاظ سے طویل نہیں مگر معنی، معلومات، کیفیات، تاریخی تعارفات اور پیش آمدہ مسائل و معاملات نیز مشاہدات کے باعث بہت بسیط ہے۔ دیوانِ غالبؔ کی طرح جو حجم میں قلیل

ہے مگر معنی میں طویل۔

13۔میری رائے میں حیدر قریشی کا یہ سفر نامہ اردو میں لکھے ہوئے حج کے سفر ناموں میں ایک بہت نمایاں اور ممتاز مقام کا حامل ہے اور سفر ناموں کے ضمن میں ایک قیمتی اضافہ جو آئندہ چل کر بہت سے نقطہ ہائے نظر سے تاریخی حوالہ جات کا کام دے گا۔

14۔یہ سفر نامہ بے شک بڑی عقیدت سے لکھا گیا ہے جس میں مصنف کے انتہائی والہانہ عقیدتی جذبات کا اظہار ہوتا ہے......مگر مصنّف بنیادی طور پر ادیب اور شاعر ہے۔اس لیے اس نے یہ سفر نامہ کھلی آنکھوں سے اپنے ماحول کو دیکھ کر ایک ادیب کے ذہن سے سوچ کر ایک شاعر کے قلم سے لکھا ہے۔جسے پڑھ کر بار بار شاعرانہ شعور کا احساس ہوتا ہے۔مصنف نے اپنی عقیدت کو اپنی ذات تک محدود رکھا ہے اور تاریخی واقعات اور مشاہدات کو قطعاً علمی اور فکری تجربات کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔یہ گویا قعرِ دریا میں اتر کر دامن خشک رکھنے والی بات ہے جس کا حافظ نے ذکر کیا تھا۔

15۔حیدر قریشی کا سفر نامہ ''سوئے حجاز'' پڑھتے ہوئے اس موضوع کا کوئی بھی سفر نامہ یاد نہیں آتا۔اس کی وجہ حیدر قریشی کا منفرد اندازِ فکر اور منفرد اسلوبِ تحریر ہے۔حیدر قریشی کا یہ امتیاز بہت نمایاں ہے کہ وہ قاری کی تمام تر توجہ اپنی جانب اس طور باندھ رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں اِدھر اُدھر کی نہ تو فرصت ملتی ہے اور نہ ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔وہ حیدر قریشی کے تخلیقی سحر میں سر تا پا شرابور ہوتا چلا جاتا ہے۔

مَیں اپنے عزیز دوست کو اس شاہکار سفر نامے پر مبارکباد دیتا ہوں۔☆☆

☆☆☆''**سوئے حجاز** میرے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔یوں لگا گویا میں آپ دونوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے سارے متبرک مناظر اور شب و روز مجھے یاد آئے۔''
(خط **افتخار امام صدیقی** مدیر ماہنامہ **شاعر** بمبئی، بنام حیدر قریشی ۱۳ر جولائی ۲۰۰۵ء)

☆☆☆سفر نامہ ''سوئے حجاز'' جہاں حیدر قریشی کے احساسات اور خیالات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے، وہاں اپنے قارئین کے لیے نہایت اہم تاریخی اور مذہبی معلومات کا خزینہ بھی ہے۔۔۔۔۔۔
حیدر قریشی نے اپنے سفر نامہ ''سوئے حجاز'' میں جگہ جگہ مختلف پیغمبروں اور نبیوں کے فرمودات، واقعات اور قرآنی حوالے پیش کیے ہیں، جن سے اُن کے وسیع دینی علم کا پتا چلتا ہے۔
(**منزہ یاسمین** کے مقالہ **حیدر قریشی شخصیت اور فن** سے اقتباسات۔ص ۱۴۴ اور ص ۱۴۶)

خاور اعجاز (ملتان)

حیدر قریشی کے انشائیے

حیدر قریشی گزشتہ ربع صدی میں ابھرنے والے ایسے قلمکاروں میں سے ہیں جنھوں نے کئی ایک اصنافِ ادب میں اپنے نقوش مرتب کیے ہیں۔غزل ہو یا نظم، ماہیا ہو یا ہائیکو، یادنگاری ہو یا انشائیہ وہ سب میں مٹر گشت کرتے نظر آتے ہیں۔اردو ادب میں انہیں کس حیثیت سے یاد رکھا جائے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن ماہیے کے ضمن میں ان کا کام اتنا قابلِ اعتنا ہے کہ آنے والے کئی سالوں تک حوالہ رہے گا۔

گزشتہ ربع صدی میں ایک نئے عروج سے آشنا ہونے والی صنفِ ادب ''انشائیہ'' میں بھی انہوں نے اپنی تخلیقی اپج کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں۔یوں تو یہ بات سبھی اصنافِ ادب پر صادق آتی ہے لیکن انشائیہ جیسی نازک خیالی پر مشتمل صنفِ ادب کے سلسلے میں لکھاری کی چشمِ تصور کا پوری طرح وا ہونا اپنے اندر معانی کی ایک اور ہی پرت رکھتا ہے جس سے ایک اچھا انشائیہ نگار یا انشائیہ کا ایک خوش نظر قاری ہی واقف ہوسکتا ہے۔حیدر قریشی نہ صرف ایک دوربین چشمِ تصور کے مالک انشائیہ نگار ہیں بلکہ ان کے انشائیے ایک اور صفت سے بھی متصف نظر آتے ہیں جسے عرفِ عام میں چیزوں کی دوسری جانب کے مناظر دیکھنے کی صلاحیت پر محمول کیا جاتا ہے۔یہ صلاحیت تخیل کو عمومی زاویوں سے ہٹ کر بروئے کار لانے کے نتیجے میں نمودار ہوتی ہے اور ایک خاص سحر کارفضاء کے جلو میں چلنے سے پھولتی پھلتی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہے کہ یہ دونوں خوبیاں حیدر قریشی میں بدرجہء اتم موجود ہیں۔ایک اچھا انشائیہ نگار ایک اچھا شاعر ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں لیکن حیدر قریشی کو دیکھتے ہوئے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایک اچھا شاعر اگر انشائیے کی طرف مائل ہوجائے تو نتائج یقیناً حوصلہ افزا نکلتے ہیں۔

حیدر قریشی کا فکری اور فنی سفر تقریباً تین دہائیوں پر محیط ہے۔انہوں نے اس عرصہ میں خود کو انتہائی فعال رکھا ہے۔اردو ادب کی بہت سی لہروں کے ساتھ سفر کیا ہے اور بدلتے ہوئے رویوں اور دھاروں کا ساتھ دیا ہے مگر اپنے تشخص کو مجروح نہیں ہونے دیا۔یہی انداز ان کے انشائیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔اپنی ادبی اور عملی زندگی کے لمحوں کو، چاہے وہ کتنے ہی کربناک کیوں نہ رہے ہوں، انہوں نے

ایک خوشگوار اسلوب میں پرو کر پڑھنے والوں کے لیے سامانِ تفریح بھی مہیا کیا ہے اور لمحہء فکریہ بھی۔ اپنے لاشعور میں پرورش پاتے ہوئے کبھی مبہم اور کبھی واضح کرداروں سے انہوں نے طرح طرح کے دلچسپ پہلو نکالے ہیں اور سادہ و پرکار جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کے انشائی پہلوؤں کو بھی خوب خوب اجاگر کیا ہے۔ اپنی کیفیات کے ہمراہ قاری کی کیفیات کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا بھی ان کے تاثرات کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور اسی کشتی میں بہنے لگتا ہے جس میں خود مصنف سوار ہے۔ اس طرح ان کے انشائیوں کا مطالعہ ایک رسمی مطالعہ نہیں رہا بلکہ حیدر قریشی کے ذہنی اور ادبی ارتقاء پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ بھی بن گیا ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں ان کی فتوحات اور شکستوں کے ساتھ موجود ہیں جو ان کے انشائیوں میں کہیں خاکہ نگاری کا رنگ بکھیر دیتی ہیں اور کہیں یاد نگاری کا، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ان ساری کیفیات کے پردے سے ایک انشائیہ ابھار لینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں انکساری اور عاجزی بھی نظر آتی ہے لیکن ان دو خورد بینوں کے ذریعے انہوں نے اپنے ارد گرد کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات کو Magnify کر کے دکھایا ہے، اس طرح سے کہ ان کے سامنے خود ان کی انکساری اور عاجزی بڑی دکھائی دینے لگتی ہے۔

حیدر قریشی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اپنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور جو یہ بھی جانتے ہوتے ہیں کہ انہیں کس شعبہء ادب کا انتخاب کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔ انشائیہ کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا ہے وہ اس صنف میں چند قابلِ قدر انشائیوں کے اضافے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے انشائیوں کا مخصوص اسلوبِ نگارش ان کی وہ بے تکلفی ہے جو عمومی طور پر پنجاب کے دیہاتوں میں ملتی ہے اور زمینی تشبیہات کے جلو میں سفر کرتی ہے۔ چند ملی جلی مثالیں ملاحظہ ہوں:

نقاب معلوم کے جہنم اور نامعلوم کی جنت کے درمیان عالمِ برزخ ہے۔ (**نقاب**)

وِگ کا سر پر سجانا تھا کہ میکدے سے میری جوانی خود ہی اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ (**وِگ**)

قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطر کود پڑنے کا نام ہے جبکہ فاصلہ ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔ اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من و تو ختم ہو جائے گا۔ (**فاصلے، قربتیں**)

بڑھاپا بارش کے بعد قوس قزح کا منظر پیش کرتا ہے۔ زندگی کے تجربوں کی دھوپ سے ہفت رنگ عکس ابھرتا ہے اور ایک حسین منظر بن جاتا ہے۔ (**بڑھاپے کی حمایت میں**)

کامل اطاعت کے وصف سے محروم لوگوں کو بھیڑوں، بکریوں کے گلوں سے سبق سیکھنا چاہیے

اور سوچنا چاہیے کہ اشرف المخلوقات کا لقب تو بھیڑ بکریوں کو ملنا چاہیے جن کے ہاں سرِ تسلیم خم کرنے بلکہ قلم کرانے کا وصف پیدائشی ہوتا ہے۔ (**اطاعت گزاری**)

گرگٹ بیچارے کو ہر کوئی لعن طعن کرتا ہے جبکہ اس کا گناہ اس سے زیادہ نہیں کہ آئینے ار پانی کی طرح یہ بھی جہاں سے گزرتا ہے اسی رنگ میں رنگین نظر آنے لگتا ہے۔۔ آئینہ، پانی اور گرگٹ تینوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ (**اپنا اپنا سچ**)

ان جملوں کی ساخت پر حیدر قریشی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ تکرار و اعادہ سے دامن بچا کر وہ اپنے اسلوب کی شگفتگی کے ہمراہ سفر کرتے ہیں۔ انشائیے کے عنوان سے جڑا ہوا شعر نہ صرف عنوان کو نکھار دیتا ہے بلکہ انشائیے کے مندرجات میں قاری کی دلچسپی کو بھی بڑھا دیتا ہے۔ کوئی بات کہنے سے پیشتر اکثر مقامات پر ان کی باندھی ہوئی تمہید پڑھنے والے کی انگلی تھام لیتی ہے۔

حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری کی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دوسرے انشائیہ نگاروں سے ہٹ کر موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور پھر موضوع کے اعتبار سے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو عام قاری کی نظر میں نہیں آ سکتے۔ ایک اچھے انشائیہ نگار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ان اشیاء، مظاہر اور ان کے چھپے ہوئے گوشوں کو سامنے لائے جو بآسانی دکھائی نہ دے سکتے ہوں۔ حیدر قریشی کی انفرادیت کا ثبوت ان کے زاویہء نگاہ میں مضمر ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ بیشتر نظر آنے والی چیزیں ویسی نہیں ہوتیں جیسی دکھائی دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات متضاد اور انتہائی مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔ حیدر قریشی بعض پیچیدگیوں کو اس فنکارانہ مہارت سے پیش کرتے ہیں کہ فلسفہ اور نفسیات کی گتھیاں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں البتہ کہیں کہیں بات سے بات نکالتے ہوئے درمیانی کڑیاں ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور ایک خلاء در آنے کے سبب روانی متاثر ہوتی ہے تاہم یہ کوئی خامی یا سقم نہیں بس یہ ہے کہ ایک بات چلتے چلتے نیا رخ اختیار کرنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے اور تسلسل قائم نہیں رہ پاتا۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں حیرت آمیز تجسس کی فضاء ہمیشہ موجود رہتی ہے اور پڑھنے والا ایک چوٹی یا عروج سے گزر کر نئی چوٹی کے نظارے میں گم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک خاص موڑ پر انشائیہ کا اختتام پذیر ہو جانا کوئی نئی بات نہیں رہی لیکن حیدر قریشی اب بھی اپنے انشائیوں کو ایک خوبصورت موڑ دے کر ختم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں جیسے ستارہ ٹوٹتے ہوئے خوب روشنی دیتا ہے۔ حیدر قریشی کے بیشتر انشائیوں کے اختتام پر دور تک جاتی ہوئی فکر کی ایک لہر مجھے اسی روشنی کے مترادف دکھائی دیتی ہے جس کے ہمراہ آپ ان سمتوں میں نکل سکتے ہیں جس طرف مصنف کا وجدان آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔

☆☆

ناصر نظامی (ہالینڈ)

منظر اور پس منظر

حیدر قریشی کی پہچان اس عہد کے ایک اہم شاعر اور ادیب کی ہے۔ وہ کئی اصنافِ ادب میں تخلیق کے گلہائے رنگا رنگ کھلا چکے ہیں۔ غزل، آزاد نظم، ماہیا، افسانہ، خاکہ، انشائیہ، سفرنامہ، یادیں، تحقیق، تنقید، غرض ان تمام اصناف میں حیدر قریشی کے معیاری کام کے گہرے نقش ثبت ہیں۔ امریکہ میں گیارہ ستمبر کے حادثہ کے بعد دنیا اور خاص طور پر اسلامی دنیا کے حالات میں جو تبدیلیاں آئیں، ان کے نتیجہ میں حیدر قریشی نے ‘‘منظر اور پس منظر’’ کے عنوان سے کالم لکھنے شروع کئے۔ یہ کالم ایک ویب سائٹ اردوستان ڈاٹ کام پر ۱۵؍اپریل ۲۰۰۲ء سے لے کر ۱۸؍نومبر ۲۰۰۳ء تک وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ بعد میں حیدر قریشی نے اپنے ۲۵ کالموں کو کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ یہی کتاب اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ پروفیسر نذر خلیق صاحب کے ساتھ ایک مکالمہ میں ادب سے کالم نگاری کی طرف آنے کی وجہ پوچھنے پر حیدر قریشی نے اپنے موقف کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے۔

‘‘**نذر خلیق:** آپ نے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد کے حالات کے پیشِ نظر **منظر اور پس منظر** عنوان کے ساتھ کالم نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ کیا ادب سے کالم نگاری کی طرف سفر کرنا ترقیٔ معکوس نہیں لگتا؟

حیدر قریشی: پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد اور تیسری دنیا کے عوام کی اکثریت کی طرح نائن الیون کے بعد امریکی کاروائیوں پر میرے بھی وہی احساسات تھے جو دوسروں کے تھے۔ لیکن مجھے یہ سب دیکھ کر چپ رہتے ہوئے شدید گھٹن ہونے لگی تھی۔ میں نے بحیثیت شاعر اور ادیب کچھ لکھا لیکن مجھے وہ سب کچھ ادبی سطح پر اچھا نہیں لگا۔ دکھ اور غصہ کی شدت ان میں غالب تھی۔ چنانچہ میں نے ایسی ساری چیزیں ضائع کر دیں۔ پھر اظہار کے نئے رستے سوچتا رہا۔ اسی دوران کالم لکھنے کا خیال آیا اور ۲۵ کالم لکھ کر مجھے جیسے سکون آ گیا۔ میں اسے ترقیٔ معکوس نہیں سمجھتا۔ ترقیٔ معکوس تب ہوتی کہ میں ادب کو صحافت کی جگہ لے آتا۔ میں اس سے بچ گیا۔ اس کی بجائے میں نے صحافت کے ذریعہ کو اس کے باوقار مقام پر اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے کالموں کے مجموعہ کی اشاعت سے خوش ہوں۔ یہ بنیادی طور پر

میرے صحافتی کالم ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان کی دیرپا حیثیت بنے گی۔ آنے والے وقت میں میرے اس لکھے کو شاید زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا۔ اگر میں سنجیدگی سے کالم لکھنے کی بجائے افسانوں اور شاعری میں للکارتا رہتا تو شاید وہ ادبی لحاظ سے ترقیٔ معکوس ہوتی۔’’

میں نے **منظر اور پس منظر** کو پڑھتے ہوئے محسوس کیا ہے کہ وہ موجودہ عالمی صورتحال کو کسی مخصوص عینک سے دیکھنے کی بجائے مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ تہذیبی حوالوں سے، مذہبی حوالوں سے، جغرافیائی حوالوں سے، تاریخی حوالوں سے، سیاسی حوالوں سے، نفسیاتی حوالوں سے لے کر مذہبی پیشینگوئیوں تک کے حوالوں سے انہوں نے موجودہ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ہمدردیاں اپنے لوگوں سے بھی ہیں لیکن وہ اپنے لوگوں کے ساتھ پوری انسانیت کی بقا کے خواہشمند ہیں۔

اگر اس کتاب کے خیالات کو نہایت اختصار کے ساتھ پوائنٹس کی صورت میں یہاں بیان کر دوں تو اس سے کتاب کے بارے میں بہتر معلومات مل سکے گی۔

☆ حیدر قریشی نے سب سے پہلے من حیث القوم مسلمانوں اور پاکستانیوں کی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کے مطابق مسلمان ملکوں کا عالمی سطح پر باہمی انتشار، مسلمان فرقوں کی باہمی نفرتیں اور دوسروں کے عقائد میں عدم برداشت سب سے بڑا گناہ ہے۔

☆ گزشتہ پچاس سالوں میں مسلمانوں کا سوویت یونین کے خلاف غیر ضروری نفرت انگیز رویہ اور امریکہ سے حد سے زیادہ ‘‘لوافیئر’’ ایک اور بڑا گناہ ہے اور یہ گناہ اس وقت انتہا کو پہنچ گیا جب پاکستان اور دوسرے مسلمان ملکوں نے افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت پر امریکہ کی جنگ کو جہاد کا نام دے کر لڑنا شروع کر دیا۔ یہ قطعاً جہاد نہ تھا بلکہ امریکہ اور سوویت یونین کی محاذ آرائی تھی، اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے کی سزا اب سارے مسلمان ملک بھگت رہے ہیں۔

☆ اسلامی جہاد کو جس طرح مغربی میڈیا غلط رنگ دے رہا ہے اس پر حیدر قریشی کا کالم ‘‘جہاد اور بعض اہم مذاہب کی تعلیمات’’ علمی لحاظ سے بہت عمدہ جواب ہے۔ اس میں عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کے عقائد ان کی اپنی ایمانی کتابوں سے بیان کر کے اسلامی جہاد کے بارے میں پروپیگنڈہ کو زائل کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆ ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں پر حملہ کرنے والے حقیقتاً کون تھے؟۔۔۔ حیدر قریشی عام مغربی پروپیگنڈہ کو رد کرتے ہوئے اس کے لئے جو واقعاتی ثبوت پیش کرتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سازش کے پیچھے کچھ اور لوگ ہیں۔ انہوں نے کافی واضح اشاروں سے ان سازشی عناصر کی نشاندہی کر دی ہے۔ انہوں

نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر واقعی کوئی القاعدہ اتنا بڑا اور خطرناک کام کر گئی ہے تو اس کے ایسے ثبوت پیش کئے جائیں جنہیں خود امریکی عدالتیں قبول کرتی ہوں۔

☆ افغانستان اور عراق پر امریکی حملوں کے پس منظر میں حیدر قریشی صرف کوئی ایک مقصد کارفرما نہیں دیکھتے بلکہ ان کے نزدیک امریکہ ایک تیر سے کئی شکار کر کے کئی مقاصد حاصل کر رہا ہے۔ اپنے پرانے وفادار جہادیوں اور موجودہ باغیوں کی سرکوبی، تیل کے ذخائر تک رسائی، تہذیبوں کی جنگ، صلیبی جنگ، عربوں پر اسرائیل کی بالا دستی، اور باقی ساری دنیا پر اپنے خوفناک اسلحہ کا رعب جمانا۔ یہ سارے مقاصد حاصل کرنا امریکی پالیسی ہے۔

☆ امریکہ اور یورپ میں کس حد تک مفاہمت ہے اور کس حد تک ان میں اختلافات ہیں، اس موضوع کو امریکہ اور یورپ کے درمیان پائے جانے والے ثقافتی اور سیاسی فرق اور ہم آہنگی دونوں حوالوں سے دیکھا گیا ہے۔

☆ پاکستان کی داخلی سیاست کے سلسلے میں وہ جنرل پرویز مشرف کی اقتدار پر آمد میں انہیں ذمہ دار قرار نہیں دیتے، اور اس لحاظ سے ان کی آمد کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو نہ صرف ملک میں واپس آنے دیا جائے بلکہ ان کی عوامی تائید کو ملک کی بقا اور ترقی کے لئے سودمند بنایا جائے۔

☆ بھارت کے ساتھ تعلقات میں حیدر قریشی دوستی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ انہوں نے جولائی ۲۰۰۲ء میں انڈو پاک تعلقات کو بہتر بنانے اور سارک یونین کو یورپی یونین کے انداز میں ترقی دینے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ ایسا وقت تھا جب پاکستان اور ہندوستان دونوں ایٹمی ملکوں کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے اور دونوں طرف کے صحافیوں اور سیاستدانوں میں سے کوئی بھی صلح صفائی کی بات سننے کا بھی روادار نہیں تھا۔ بعد میں حالات تبدیل ہوئے تو محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی طرف سے ایسی تجویز سامنے آئی اور مشاہد حسین اور ارشاد احمد حقانی جیسے جید صحافیوں نے بھی پاک بھارت تعلقات کو کنفیڈریشن کی سطح تک لانے کی پرانی تجاویز کا تفصیلی ذکر کیا۔

☆ حیدر قریشی کے نزدیک پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی راہ میں دونوں طرف کے مذہبی انتہا پسند رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

☆ اسلامی دنیا کے حوالے سے انہوں نے سعودی عرب اور پاکستان کی مثالوں سے اسلامی دنیا کا نقشہ کھول کر بیان کیا ہے۔ دونوں ملکوں کی پولیس عوام کی خدمت اور قانون کے نفاذ سے زیادہ اپنے حکمرانوں کے اقتدار کے تحفظ پر توجہ دیتی ہے اور اپنے عوام کو ذلیل کرتی ہے۔ اسی طرح دونوں ملکوں کا

ٹریفک کا نظام مسلمان حکومتوں کے پورے سسٹم کی بدنظمی کو ظاہر کرتا ہے۔

☆ موضع میر والا کی مظلوم خاتون مختاراں مائی کے بارے کالم لکھتے ہوئے بھی اور عمران خان کے خلاف چلائی جانے والی گمنام فحش پوسٹر بازی کی مذمت کرتے ہوئے بھی انہوں نے ان رویوں کو مسلمان ملکوں کے المیوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہاں ان دونوں کالموں کے اختتامی حصوں کے اقتباس درج کر دیتا ہوں۔

☆☆ ''مجھے ایسے لگا ہے جیسے مختاراں بی بی ہی فلسطین اور عراق ہے، اور مختاراں بی بی ہی کشمیر اور افغانستان ہے۔۔۔۔ امریکہ اور اس کے سارے حلیفوں نے، اسرائیل اور ہندوستان نے۔۔۔ سب نے مل کر چاروں اطراف سے مختاراں بی بی پر حملہ کر دیا ہے۔ فلسطین، عراق، کشمیر، افغانستان سب لٹ گئے ہیں۔۔۔۔ مختاراں بی بی لٹ گئی ہے۔
آیئے ہم سب مل کر مختاراں بی بی کے لئے روئیں!''

☆☆ '' مجھے لگتا ہے عمران خان کے خلاف چلائی جانے والی گندی مہم ہمارے جس قومی اخلاقی زوال کی نشانی ہے، وہ زوال پورے عالم اسلام میں نفوذ کر چکا ہے۔ عالمِ اسلام عمومی طور پر اپنی بیشتر سماجی اور سیاسی سطحوں پر اس وقت انتہائی خود غرضی اور مفاد پرستی کی دلدل میں دھنس چکا ہے، اس دلدل سے بچ نکلنے والوں کے لئے آگے امریکی صدر بش اور ان کے مشیروں کی بنائی ہوئی دلدل موجود ہے۔''

حیدر قریشی نے اپنے کالموں کے ذریعے سب سے پہلے گریٹر اسرائیل منصوبے کے بارے میں بتایا کہ مکہ اور مدینہ کو بھی اسرائیل کا حصہ بنایا جانا ہے۔ ان کے کالم کی اشاعت کے بعد ٹی وی اور اخبارات میں اس سنگین مسئلہ کا کافی چرچا ہوا۔ بعض علماء نے بھی کہا کہ ہم نے گریٹر اسرائیل کا نقشہ منگا کر دیکھا ہے واقعی اس میں مکہ اور مدینہ کو اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ لیکن چند دنوں کی تشویش اور گفتگو کے بعد بقول حیدر قریشی سارے ٹی وی چینل، اخبارات اور قومی رہنما ''پھر خوابِ خرگوش میں چلے گئے''۔

ایک اور کام جو حیدر قریشی کا منفرد انداز کہا جا سکتا ہے انہوں نے آج کے حالات کو مذہبی پیشین گوئیوں کے حوالے سے بھی دیکھا۔ انہوں نے ایک کالم میں پیشگوئی کا ذکر کیا تو اس سے عین اگلے روز اے آر وائی چینل کے معروف سیاسی دانشور ڈاکٹر شاہد مسعود نے اپنے پروگرام میں اسی حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ پورا پروگرام پیش کر دیا۔ لیکن حیدر قریشی نے دیکھا کہ وہ پروگرام کسی ہوم ورک کے بغیر جلدی میں پیش کیا گیا تھا اسی لئے اس میں کام کی باتیں ہو نہیں سکیں۔ اس کے نتیجہ میں حیدر قریشی نے پھر ایک تفصیلی کالم لکھا جس میں وہ بیشتر پیشگوئیاں درج کر دیں جو آج کے حالات کی سنگینی کی نشاندہی کرتی تھیں۔ گریٹر اسرائیل اور مذہبی پیشگوئیوں کے سلسلے میں حیدر قریشی کے بنیادی کام کے ذکر پر جب

پروفیسر نذر خلیق نے ان سے سوال کیا تو ان کا سوال اور جواب خود ہی پڑھ لیجئے۔

''**نذر خلیق:** کیا ٹی وی چینل والوں نے کہیں آپ کا حوالہ دیا ہے؟

حیدر قریشی: میرے بھائی ملک کے مقتدر طبقوں کی طرح ہمارے اس نوعیت کے دانشور بھی کسی دوسرے کے کام کا اعتراف کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے دستیاب وسائل کی بنیاد پر میری تضحیک کا سامان کر دیں لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ میرے کام کی بنیادی اہمیت کو کسی رنگ میں بھی سامنے آنے دیتے۔ الیکٹرانک میڈیا بے شک بہت موثر ہے لیکن ہم جیسے گنہگار اسی طرح تاریخ میں اپنا بیان محفوظ کر لیتے ہیں۔ اگر ہمارے مقتدر طبقوں کی یہ ''میں'' حائل نہ ہوتی تو عالمِ اسلام اس عبرتناک حال کو کیوں پہنچتا۔''

اردوستان ڈاٹ کام کے ایڈیٹر کاشف الہدیٰ (مقیم امریکہ) نے حیدر قریشی کی کالم نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''حیدر قریشی صاحب کو اپنی قوم اور ملک سے بے حد محبت ہے۔ جو بھی لکھتے ہیں، سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ بات کی تہہ تک پہنچ جانا اور پھر قاری کو اپنا موقف اس طرح سمجھاتے ہیں کہ ان سے اتفاق رائے کرنا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان کے کالم کا نام ''منظر اور پس منظر'' ہے، اور واقعی وہ منظر کا پس منظر یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری حیران ہوجاتا ہے۔''

میرے نزدیک حیدر قریشی کے کالموں کا مجموعہ ''منظر اور پس منظر'' ہماری مقامی صورتحال سے لے کر عالمی صورتحال تک کو گہری نظر سے دیکھنے والی بڑی فکر انگیز کتاب ہے۔ اس میں لکھی ہوئی بعض باتیں آنے والے وقت میں اس کتاب کی اہمیت کا احساس دلائیں گی۔

☆☆

''حیدر قریشی کی کالم نگاری اپنے عہد کے تکلیف دہ عالمی حالات کو اس کے تاریخی پس منظر سے سمجھنے کی ایک کاوش ہیں، ایسی کاوش جس میں انسانیت کے بہتر مستقبل کے لئے نئی راہوں کے لئے اشارے بھی دیئے گئے ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنے کالموں سے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دینے کے ساتھ یہ باور کرایا ہے کہ ادیب اپنے سماج سے لاتعلق نہیں ہوتا اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ خالص ادب اور صحافت ایک دوسرے سے قریب تو ہیں لیکن دونوں الگ الگ میدان ہیں۔''

(**پروفیسر نذر خلیق** کے مضمون ''**حیدر قریشی بحیثیت کالم نگار**'' سے اقتباس
بحوالہ کتاب ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' مرتب پروفیسر نذر خلیق۔ ص ۲۶۲)

ناصر عباس نیر (لاہور)

حیدر قریشی کے انٹرویوز

حیدر قریشی کا تعلق ستر کی دہائی میں سامنے آنے اردو ادبا کی نسل سے ہے۔ اس دہائی میں اردو ادب میں جدیدیت کا غلغلہ بے حد بلند تھا۔ جدیدیت بلاشبہ ہمارے یہاں مغرب سے آئی تھی، مگر مغرب میں جدیدیت کو جس طور تخلیقی، فلسفیانہ اور تنقیدی سطح پر برتا گیا تھا اور وہاں فکشن میں بالخصوص جدیدیت کے زیرِ اثر جو نمونے سامنے آئے تھے (''یولیسس'' سے لے کر ''میٹا مارفوسس'' تک) ہمارے یہاں جدیدیت کو نہ اس طور برتا جاسکا ہے اور نہ جدید فکشن میں کوئی بڑا کام سامنے آسکا ہے، جسے جدید عالمی ادب کے سامنے اعتماد سے پیش کیا جاسکے۔ ہمارے یہاں جو نام جدید فکشن کے بنیاد گذار کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان کا فن دراصل بعض پرانی بیانیہ روایات کے احیا سے عبارت ہے۔ جب کہ جدید اپنی روح کے اعتبار سے تاریخی عدم تسلسل اور ایک منفرد، یکسر نئی شناخت اور انفرادی جمالیات کی تشکیل کرتا ہے۔ پرانی روایت کو نئے، عصری محاورے میں پیش کرنا جدت کہلا سکتا ہے جدید نہیں۔ (جدت اور جدیدیت کے فرق کو عموماً نظر انداز کیا گیا ہے)۔ دوسری طرف جن لوگوں نے جدید کا مطلب ایک یکسر نئی جمالیات کی تشکیل لیا وہ اس تخلیقی صلاحیت سے محروم تھے جو قدیم کے انہدام اور نئے کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ یعنی یہ انہدام تو کرتے تھے مگر ایک ایسی نئی تعمیر سے قاصر تھے جو قدیم کا متبادل ہو اور اس سے پیدا ہونے والی خالی جگہ کو پر کرتی ہو۔ چناں چہ یہ لوگ اپنی ساری قوت ہیئتی سطح کے بے ثمر تجربات میں صرف کرنے لگے۔ نتیجہ معلوم!

ستر کی دہائی میں آنے والی نسل کے سامنے یہ سب ہو رہا تھا۔ اسے اب اپنی شناخت بنانی تھی۔ ہر نسل اپنے ابتدائی سفر میں اپنی پیش رو نسل سے اثر پذیر ہوتی، مگر پھر وہ اپنی جداگانہ شناخت کی خاطر پیش رووں کا تجزیہ اور محاسبہ کرتی ہے۔ ستر کی دہائی والی نسل نے بھی اولاً جدیدیت کے اثرات قبول کیے اور بعد ازاں اس جدیدیت کا محاسبہ کیا۔ محاسبے کی تحریک دراصل جدیدیوں کی بعض انتہا پسندانہ روشوں اور جدیدیت کو سطحی طور پر لینے کا ردعمل تھی۔ یہ محاسبہ کرنے والوں میں حیدر قریشی بھی شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حیدر قریشی نے اپنی ادبی شناخت اپنے پیشرووں کے تخلیقی رویوں کے تجزیے

کے نتیجے میں قائم کی ہے۔انہوں نے اپنے مقالات اور انٹرویوز میں متعدد مقامات پر اردو جدیدیت کے جعلی رویوں پر گرفت کی ہے۔اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ان کے معاصرین اپنے پیش رووں کی مانند پلاننگ کر کے نہیں لکھتے بلکہ تخلیقی انداز میں اپنے اندر کی آواز پر لکھتے ہیں۔حیدر قریشی نے جدیدیوں کے ساتھ ساتھ ان ترقی پسندوں سے بھی اپنی برات کا اعلان کیا ہے جو ادب کو ایک نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔انہیں احساس ہے کہ ان کی تحریریں سماجی زندگی کے ٹھوس تجربات سے اپنا بنیادی مواد اخذ کرتی ہیں اور وہ ایک خاص مفہوم میں ترقی پسند ہیں۔مگر وہ تجربے کو اپنی روح میں حل کرنے اور پھر ایک فطری اور تخلیقی انداز سے تجربے کے اظہار کے قائل ہیں۔اس اعتبار سے ان کی بنیادی شناخت (اپنے بیشتر معاصرین کی مانند) اپنے عہد کی دو بڑی تحریکوں (جدیدیت اور ترقی پسندی) سے ہٹ کر ایک اپنا راستا اختیار کرنے میں ہے۔وہ اسے کوئی خاص نام دینے کی کوشش نہیں کرتے۔گوپی چند نارنگ صاحب اس نسل کے تخلیقی رویوں کو مابعد جدیدیت سے موسوم کرتے ہیں۔لیکن مابعد جدیدیت سے جو تصورات وابستہ ہیں وہ اس نسل کے تخلیق کردہ ادب میں بالعموم نہیں پائے جاتے۔اس نسل کی شناخت کے لیے اگر اسے کوئی نام دینا ضروری بھی ہو تو اسے ''آزاد تخلیقی رویہ'' کہنا مناسب ہے۔

حیدر قریشی کی فکر ہر چند وزیر آغا کے ادبی نظریے سے مستنیر ہوئی ہے اور اس امر کے اعتراف میں انہیں کبھی تامل نہیں ہوا،مگر انہوں نے اپنی مسلسل محنت، جاں کاہی اور ریاضت سے ایک اپنا مقام پیدا کیا ہے،اور اس کے لیے وہ کسی کے مرہونِ منت نہیں ہیں۔وزیر آغا سے انہوں نے یہ نکتہ لیا ہے کہ ادب کی تخلیق ایک بے ریا عمل ہے۔اندر کی آواز سب سے مستند ہے،اگر یہ آواز تخلیق کار کو سنائی دے رہی ہے تو اسے کسی سے سند لینے کی ضرورت نہیں۔اس نظریے کو اپنی گرہ میں باندھ کر حیدر قریشی نے جو متعدد سمتوں میں قابلِ قدر کام کیا ہے،اس پر حیدر قریشی کی انفرادیت کی مہر ثبت ہے۔

حیدر قریشی نے غزل،نظم،افسانہ،انشائیہ،خاکہ،آپ بیتی،سفرنامہ،تنقید،تحقیق لکھی ہے۔رسالہ ''جدید ادب'' کے مدیر ہیں۔اور ماہیے کے سلسلے میں ان کی خدمات اس قدر زیادہ اور اہم ہیں کہ ماہیے کے ساتھ ان کا نام اسی طرح وابستہ ہے جس طرح مثنوی کے ساتھ مولانا روم کا،مغربی انشائیے کا ساتھ مونتین کا اور اردو انشائیے کے ساتھ وزیر آغا کا۔حقیقت یہ بھی ہے کہ انہیں غیر معمولی شہرت اور اہمیت ماہیے کی وجہ سے ہی ملی ہے۔کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دوسری حیثیتیں ثانوی ہیں یا کم اہم ہیں۔ہرگز نہیں۔شہرت انہیں پہلے بھی حاصل تھی اور ان کی شاعری اور افسانہ اہم سمجھے گئے تھے۔لیکن ان کے نام کا ڈنکا ماہیے کے فروغ کے ضمن میں ہی بجا ہے۔اور ان پر جو تنقیدی کام ہوا ہے وہ نوے کی دہائی کے بعد ہی ہوا ہے،جب ماہیے کے حوالے سے انہیں قبولیت و استرداد کے عمل سے گذرنا پڑا۔جب ماہیے کے

سلسلے میں ان کی آرا کو اہم گردانا جانے لگا تو ان کے خیالات جاننے کی جستجو بھی کی جانے لگی۔غالباً جبھی ان کے انٹرویو کیے جانے لگے۔(جوگندر پال والا انٹرویو اس سے پہلے کا لگتا ہے)۔

جب کسی ادیب کے انٹرویو تواتر سے کیے جانے لگتے ہیں اور انہیں کتابی صورت میں بھی یکجا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ادیب خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور اس کے خیالات وزنی سمجھے جانے لگے اور اس کی آرا اہم گردانی جانے لگی ہیں۔اس کتاب میں یوں تو رسمی،غیر رسمی،سرسری،مفصل ہر قسم کے انٹرویو شامل ہیں۔بعض انٹرویو ایسے بھی ہیں جو دو دانشوروں کے درمیان مکالمے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔تاہم بیشتر انٹرویوز میں حیدر قریشی کی آرا اور خیالات جاننے اور ان کی ذاتی اور ادبی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی جستجو کی گئی ہے۔گویا ان کی ذاتی اور ادبی زندگی کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ انٹرویو کیے گئے ہیں۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کتاب میں ہمہ قسم کے انٹرویوز شامل ہیں۔یہ تمام انٹرویو حیدر قریشی کی پوری شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔یعنی حیدر قریشی کی سوانح،ان کی ابتدائی تعلیم،ملازمت،شادی، ادبی زندگی کا آغاز،ان کے شخصی میلانات،ان کے حلقہ احباب،ان کے مذہبی میلانات،ان کے ادبی نظریات،ان کی ادبی فتوحات،اور ان کی تخلیقات کے امتیازات۔۔۔۔سب باتوں کو ان انٹرویوز کے ذریعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔بہت سی باتیں انہوں نے خود کہی ہیں اور بعض باتیں ان کے احباب اور اعزا نے کہہ دی ہیں۔اس زاویے سے تو تمام انٹرویو اچھے اور اہم ہیں،لیکن اگر انٹرویو سے مراد محض نجی اور سوانحی معلومات سے بڑھ کر دو اشخاص کے درمیان ایک فکری مکالمہ لیا جائے،ایک یا چند موضوعات پر دو مشاہیر کا تبادلہ خیالات لیا جائے،ایک دوسرے کے فکری باطن کو کریدا جانا مقصود ہو تو اس کتاب میں تین ایسے انٹرویو بھی موجود ہیں۔جو جوگندر پال،اختر رضا سلیمی اور نذر خلیق نے لیے ہیں۔

ہر انٹرویو میں انٹرویو کے دونوں فریق آزمایش میں ہوتے ہیں۔انٹرویو لینے والے کی آزمایش یہ ہے کہ وہ کہاں تک سامنے بیٹھے ہوئے ہوئے شخص کی ذات کو کریدنے اور اس کے باطن کے چھپے گوشوں کو منظرِ عام پر لانے میں کامیاب ہوتا ہے اور انٹرویو دینے والے کی آزمایش یہ ہے کہ وہ سوالات کے برمحل،برجستہ جوابات دینے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ سوائے مذکورہ تین انٹرویوز کے باقی ہر انٹرویو میں حیدر قریشی سے انٹرویو کرنے والے آزمایش میں محسوس ہوتے ہیں۔ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بعض انٹرویو تحریری اور انٹرنیٹ کے ذریعے لیے گئے ہیں جن میں سوال اندر سوال اٹھانے کی سہولت نہیں ہوتی۔ تمام انٹرویوز میں حیدر قریشی نے جوابات برمحل،بے ساختہ،دلچسپ اور برجستہ دیے ہیں۔ حیدر قریشی کے ان انٹرویوز کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے موقف کو کسی مصلحت کو ملحوظ رکھے بغیر پیش

کرتے ہیں۔مثلاً وہ مغرب میں رہتے ہوئے وہاں کے اردواد با سے متعلق اپنے خیالات بے باکانہ نداز میں ظاہر کرتے ہیں۔یہ خیالات چشم کشا ہیں۔جو حضرات امریکا اور یورپ کو اردو کی نئی بستیاں قرار دے رہے ہیں ان کو یہ انٹرویوز ضرور پڑھنے چاہییں۔۔۔۔اوپر جن تین انٹرویوز کا ذکر ہوا ان میں حیدر قریشی کو واقعی آزمایش میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان سے سرسری سوالات کے جوابات نہیں طلب کے گئے، بلکہ ان سے مکالمہ کیا گیا ہے۔ان کے فکری اور تخلیقی باطن کو کھنگالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان میں حیدر قریشی نے جدیدیت، جدید افسانہ، ساختیات، اپنے نظریہ ادب، ماہیے کے فنی مسایل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ماہیے کے سلسلے میں ان کی وضاحتوں سے کئی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔اور ان انٹرویوز کی افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔

اپنے انٹرویوز میں حیدر قریشی نے کئی اہم نکات بھی اٹھائے ہیں جن پر بحث ہو سکتی ہے۔مثلاً انہوں نے ڈاکٹر صابر آفاقی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے:''ماہیا اردو میں ایسے وقت میں مقبول ہوا جب جدید شاعری کے نام پر انتہا پسند تجربوں کے ذریعے ہمارے انتہا پسند تخلیق کاروں نے شاعری کا رشتہ معنویت کی بجائے لایعنیت سے جوڑ لیا تھا۔'' گویا ان کے خیال میں جدید شاعری میں زمینی رشتوں کا احساس نہیں تھا۔ماہیا اپنی شعریات کی رو سے زمین سے مربوط ہوتا ہے۔یہ ایک خیال انگیز نکتہ ہے جس پر مزید گفتگو کی جانی چاہیے۔اسی طرح انہوں نے سلطانہ مہر کو انٹرویو دیتے ہوئے اردو میں مغرب کی طرح ناول کے فروغ نہ پانے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے''جز میں کل کو دیکھنے کے مشرقی مزاج کے باعث ہمارے ہاں افسانہ نگاری زیادہ مقبول ہوئی اور ناول کی طرف رجحان کم ہوا۔ناول کا انداز بنیادی طور پر مغربی مزاج سے میل کھاتا ہے۔'' یہ نقطۂ نظر بھی خیال انگیز ہے اور بحث طلب بھی!
شاید قریشی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ناول میں جو تجزیاتی انداز اختیار کیا جاتا ہے وہ ہمارے مزاج کا اس طرح حصہ نہیں بنا جس طرح اہلِ مغرب کے ثقافتی مزاج کا حصہ ہے۔لیکن اردو میں اچھی خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔اور ان میں خاصے ضخیم بھی ہیں اور معیاری بھی۔افتخار امام صدیقی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے مابعد جدیدیت کے حوالے سے جمیل جالبی کی رائے دہرائی ہے کہ یہ یہودی سازش ہے۔یہ رائے بھی گفتگو کو دعوت دیتی ہے۔کیا علمی نظریات اور تنقیدی تصورات کے پس منظر میں سیاسی سازشیں کارفرما ہوتی ہیں؟ سوال یہ بھی ہے کہ جمیل جالبی کو آرنلڈ اور ایلیٹ تک تو سازش نظر نہیں آتی مگر بارت، دریدا، ٹیری ایگلٹن، جیمی سن وغیرہ کے یہاں سازش نظر آنے لگتی ہے۔

بہر کیف حیدر قریشی کے انٹرویوز میں متعدد ایسے نکات ظاہر ہوئے ہیں، جو قاری کو غور و فکر اور بحث مباحثے کی دعوت دیتے ہیں۔اور ایک اچھے انٹرویو کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص شخصیت کے

نقطۂ نظر کے حوالے سے قاری کے بعض سوالات کے جوابات دے تو اس کے اندر بعض نئے سوالات بھی ابھارے یا سوالات پر نئے زاویوں سے تامل کرنے پر اسے مائل کرے اور اسے فکری سطح پر متحرک کرے۔اس اعتبار سے یہ کتاب بے حد کامیاب ہے!! ☆☆

(یہ مضمون کتاب **انٹرویوز** میں بطور پیش لفظ شامل ہے)

اس کتاب میں دو طرح کے انٹرویوز شامل ہیں۔ایک تو وہ انٹرویوز جو حیدر قریشی سے وقتاً فوقتاً لئے گئے۔دوسرے وہ انٹرویوز جو اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کی طالبہ منزہ یاسمین نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے سوالنامے کے طور پر کئے تھے۔یہ سوالنامہ حیدر قریشی کے بعض عزیز و اقارب اور ادبی دوستوں کو بھیجا گیا۔ان کی طرف سے جو جواب موصول ہوئے ان کی ایک اہمیت ہے۔تحقیقی مقالہ میں سارے جوابات سے استفادہ نہیں کیا جا سکا تھا۔اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔تحقیقی ضرورت کے مطابق زیادہ اہم حصوں کو لے لیا گیا۔اسی طرح بعض جوابات لکھے گئے اور منزہ یاسمین کو بھیج دیئے گئے لیکن قدرے تاخیر سے ملنے کی وجہ سے وہ ان جوابوں سے استفادہ نہ کر سکیں۔ لیکن ان کے سوالنامہ کی بنیاد پر جن لوگوں نے جواب لکھے تھے ان سب کی اہمیت کے پیشِ نظر ان سارے سوالوں اور جوابوں کو ''انٹرویوز'' کے دوسرے حصے میں شامل کر لیا ہے۔اس لحاظ سے انٹرویوز کا یہ مجموعہ ایسے دو طرح کے انٹرویوز کی وجہ سے ایک منفرد رنگ اختیار کر گیا ہے۔حیدر قریشی کے انٹرویوز سے ان کے ادبی خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان کی تحریروں کے بارے میں بہتر واقفیت ہوتی ہے۔اس بارے میں ناصر عباس نیر کے سیر حاصل پیش لفظ کے بعد میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ان کے قریبی رشتہ داروں کے انٹرویوز سے بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آئی ہیں لیکن میں ایک ایسی اہم بات یہاں بیان کروں گا جو ان کے رشتہ داروں میں سے کسی نے کسی رنگ میں نہیں بتائی۔جب حیدر قریشی خانپور میں تھے تب وہ اردو میں دستخط کیا کرتے تھے۔بنک اکاؤنٹ ہو یا کوئی سرکاری دستاویز، ہر جگہ انہوں نے اردو میں دستخط کئے۔میرا خیال تھا کہ جرمنی میں جا کر انہوں نے اردو میں دستخط کرنا ترک کر دیا ہوگا لیکن ایک بار میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ میں یہاں بھی ہر سرکاری یا غیر سرکاری کاغذ پر اردو میں ہی دستخط کرتا ہوں ۔جرمن پاسپورٹ پر بھی اردو میں دستخط کئے ہیں۔یہ کوئی ایسی بڑی خبر نہیں ہے۔لیکن اس سے حیدر قریشی کی افتادِ طبع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(کتاب **حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز** کے مرتب
سعید شباب کے ''عرضِ مرتب'' سے اقتباس)

اسلم رسولپوری (جام پور)

حیدر قریشی کے انٹرویوز

جناب سعید شباب کی مرتب کردہ کتاب (حیدر قریشی سے لئے گئے) **انٹرویوز** ابھی ابھی پڑھ کر میں نے ختم کی ہے اوراس کا فوری تاثر میرے ذہن پر باقی ہے، میرا خیال ہے اسے فوری طور پر لکھ دینا زیادہ غیر جانب دارانہ ہوگا۔ یہ انٹرویوز دو قسم کے ہیں ایک تو وہ انٹرویوز ہیں جو حیدر قریشی سے لئے گئے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو حیدر قریشی کے بارے میں لئے گئے ہیں۔ جن میں کچھ ایم۔اے کی ایک طالبہ منزہ یاسمین نے اپنے تھیسس کے لئے، لئے ہیں جو وہ جناب حیدر قریشی پر لکھ رہی تھیں۔

آغاز میں ان انٹرویوز سے کرنا چاہوں گا جن کا تعلق حیدر قریشی کی ذات سے ہے کیونکہ میرے اپنے نکتہ نظر کے مطابق اگر ہم کسی تخلیق کار کی ذات کے اندر جھانک سکتے ہیں تو یہ اس کی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ ایسے انٹرویوز میں دو اہم ہیں۔ ایک تو فرحت نواز شیخ کا اور دوسرا حیدر قریشی کی بیگم صاحبہ کا۔ فرحت نواز شیخ ان کی دوست اور بہت ہی قریب سے جاننے والی ہیں۔ انہوں نے حیدر کے بارے میں بتانے سے کچھ کنجوسی سے کام لیا ہے اگر وہ ان کی درویشانہ بددعاؤں سے خوف زدہ نہ ہوتیں تو ہمیں حیدر قریشی کی اندر کی دنیا کو سمجھنے میں مدد ملتی جس کی آواز پر وہ لکھتے ہیں اوراس طرح یہ انٹرویو ہمیں زیادہ کچھ دے سکنے کے باوجود نہ دے سکا۔

جہاں تک ان کی بیگم صاحبہ کے انٹرویو کا تعلق ہے۔ اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک اہل قلم کی مصروفیات کس طرح ان کی بیویوں کے لئے سوکن کا کام دیتی ہیں۔ اس انٹرویو سے ہمیں حیدر قریشی کی بے پناہ ادبی مصروفیات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے لئے وقت کی کتنی قربانی دیتے ہیں۔ جہاں تک حیدر قریشی سے لئے گئے انٹرویوز کا تعلق ہے تو ہم ان میں سے ان حصوں کو ترک کر رہے ہیں۔ جو ان کی تاریخ پیدائش، تعلیم، شادی، بچوں اور نوکری وغیرہ جیسے سوالات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان انٹرویوز میں کئی جگہ تخلیقی عمل جیسے بنیادی سوال بھی سامنے آئے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی عمل اندر کی آواز کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ سلطانہ مہر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے نزدیک بنیادی اہمیت اندر کی آواز کو ہے۔ اسی طرح ثریا شہاب کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ اقبال اور فیض دو انتہاؤں کے نظریات رکھنے والے شاعر تھے لیکن دونوں نے زیادہ تر اپنے باطن کی آواز پر لکھا اس لئے وہ اعلا شاعر تھے۔ حیدر صاحب نے اپنے تخلیقی تجربے کی شدت اوراذیت کو بھی بیان کیا ہے۔ نذر خلیق صاحب سے انٹرویو کے دوران انہوں نے بتایا کہ انہوں دو ایسی کہانیاں لکھیں جن کے لکھنے کے بعد وہ جی بھر کر روئے۔ اپنے لکھنے کے محرک کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ محبت کا جذبہ میرے لئے لکھنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ اور شاید اسلئے شاعری ان کی پہلی ترجیح رہی ہے

حیدر قریشی نے بہت سی اصناف میں قابل قدر کام کیا ہے لیکن انہوں نے نذر خلیق کو یہ بھی بتایا کہ جب تک مجھے اندر اور باہر سے بیک وقت لکھنے کی تحریک نہیں ہوتی تو اس وقت تک میں نہیں لکھتا۔ انہوں نے مختلف اصناف پر اپنے لکھنے کے عمل کے بارے میں کہا کہ جو اصناف میرے مزاج سے قریب تھیں میں نے ان میں تخلیقی کام کیا۔ اورانہوں نے ان مختلف اصناف میں لکھنے کے عمل کو مختلف پڑاؤ کا نام دیا۔ حیدر قریشی صاحب کے انٹرویوز کے حوالے یہ سب کچھ میں نے اس لئے آپ کے سامنے پیش کیا ہے کہ آپ ان کے تخلیق کار ہونے کے بارے میں خود فیصلہ کر سکیں کہ وہ رولاں بارت کی ادیبوں کی تقسیم کے کس درجے میں آتے ہیں۔ آیا وہ Ecrivant یعنی وہ منشی قسم کے ادیب ہیں یا Ecrivain یعنی تخلیقی قسم کے ادیب۔ اگر آپ نے ان کی کوئی تخلیق نہیں بھی پڑھی تو بھی میرا خیال ہے کہ ان کے ان نظریات کی روشنی میں بھی آ پ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص تخلیق کے عمل اور تقاضوں کو سمجھتا ہے وہ ایک حقیقی اور سچا تخلیق کار ہے۔ حیدر قریشی کا تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کام نا قابل یقین حد تک زیادہ ہے بعض میدانوں میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے جیسے ماہیے کا میدان۔ اس میں ان کا تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کام اتنا زیادہ ہے کہ شاید کوئی دوسرا عمر بھر نہ کر سکے۔ ان سے لئے گئے تقریبا ہر انٹرویو میں ماہیے پر بات ہوئی ہے لیکن اختر رضا سلیمی کے لئے گئے انٹرویو میں تو تمام گفتگو ہی ماہیے پر ہوئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ انہوں نے تخلیقی، تحقیقی۔ اور تنقیدی کام ہی نہیں کیا بلکہ ماہیے کی بقا کے لئے ایک جنگ بھی لڑی ہے اور بہت سی دوستیاں بھی گنوائی ہیں۔ انہوں نے ماہیے کے سلسلے میں پنجابی ماہیے کا ذکر کیا ہے لیکن سرائیکی ماہیے کو بھول گئے ہیں حالانکہ سرائیکی ان کی اپنی زبان ہے اور سرائیکی میں جتنا ماہیا ہے وہ پنجابی میں شاید ہو۔ اور سرئیکی علاقے میں کوئی بھی بستی ایسی نہ ہوگی جہاں لوگ ماہیا نہ گاتے ہوں۔ اردو شاعری کے بارے میں کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں دھرتی کی خوشبو اور مہک نہیں ہوتی، حیدر قریشی نے ان کا یہ شکوہ ماہیے کی صنف کے ذریعے ہمیشہ کے لئے دور کر دیا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حیدر قریشی ایک شاعر، افسانہ نگار، محقق، نقاد یا انشائیہ نگار اور سفر نامہ نگار ہیں، لیکن یہ بات شاید کچھ لوگوں کے علم میں نہ ہو کہ وہ ایک سیاسی کالم نگار بھی ہیں اور انہوں نے اپنے

سیاسی کالموں میں جو اہم تجاویز دیں یا اپنی سیاسی بصیرت کی بنیاد پر کچھ پیشین گوئیاں کیں وہ بعد میں کس طرح حقیقت کا روپ دھار گئیں۔ حیدر قریشی کے ان کالموں پر مشتمل کتاب ،منظر اور پس منظر، کے نام سے چھپی ہوئی ہے جس میں سارک کے قیام سے پہلے جنوبی ایشیا میں یورپی یونین کی طرز پر ایک تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔اس طرح انہوں نے گریٹر اسرائیل کے اسرائیلی منصوبے کی بھی نشاندہی کی تھی ،جس کو بعد میں مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی تسلیم کیا تھا اور اس پر ٹی ۔ وی پروگرامز میں بھی بحثیں ہوئیں مگر کسی نے اس بات کا حوالہ نہ دیا کہ اس منصوبے کے بارے میں سب سے پہلے کس نے لکھا ہے۔میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بڑے ناول یا کہانیوں میں مستقبل کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں اگر یہ بات درست ہے تو پھر حیدر قریشی کی کہانی ،حوا کی تلاش، دنیا کی ایک ایسی ہی بڑی کہانی ہے۔حیدر قریشی سے لئے گئے اور ان کے بارے میں لئے گئے انٹرویوز پر مبنی یہ کتاب ایک ایسی کتاب ہے جو ان کی ذاتی اور ادبی زندگی کو سمجھنے کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کتاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر قریشی کی کوئی ذاتی زندگی ہے ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی صرف ادبی زندگی ہی ہے۔☆☆

''حیدر قریشی اپنی تمام تخلیقات میں خود سانس لیتے ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہوئے موجود ہیں۔خود اس طرح کہ ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ان سے وابستہ تمام اہم کردار بھی ان کی تخلیقات میں موجود ہیں۔ ۔۔ دوسروں کے ہاں خاکوں اور یادوں کے باب میں ایسی زندگی مل جاتی ہے کہ وہاں ان کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔لیکن حیدر قریشی تو شاعری،افسانہ،انشائیہ،سفر نامہ،حتیٰ کہ انٹرویوز تک میں بھی۔۔۔۔اپنی زندگی،اپنے رشتوں،اپنی محبتوں کو ہی بیان کرتے ہیں اور انداز بیان ایسا کہ آپ بیتی، جگ بیتی بن جاتی ہے۔اپنی تمام تخلیقات میں اس طرح سے زندگی بسر کرنا اس عہد کے تمام شاعروں اور ادیبوں میں حیدر قریشی کی الگ پہچان ہے۔اس زاویے سے ان کی تمام تخلیقات خود ایک تحقیقی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہیں۔''

(**پروفیسر فرحت نواز** بحوالہ **انٹرویوز** مرتب:**سعید شباب** ص۱۳۳)

''حیدر قریشی کا شعری سفر ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔انہیں میں نے بیس سوالات پر مشتمل سوالنامہ بھیجا تھا جس کا جواب انہوں نے تفصیل سے دیا۔ان کی تحریر میں مطالعہ اور فکر کی عمیق گہرائی ملتی ہے۔آپ ان کے نظریات،ان کی سوچ اور ان کے مطمع نظر سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی کہی ہوئی باتوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔یقیناً ان کے جوابات فکر کی نئی راہیں کھولتے ہیں اور مزید دعوت فکر دیتے ہیں''

(**سلطانہ مہر** بحوالہ کتاب **سخنور** صفحہ نمبر۱۳۲۔مطبوعہ امریکہ ۱۹۹۶ء)

پروفیسر نذر خلیق (خانپور)

اردو ماہیا اور حیدر قریشی

اردو ماہیا کے بارے میں اب تک جتنے مباحث ہو چکے ہیں ،وہ مباحث اختلاف کو ابھارنے والے ہوں یا اتفاق رکھنے والے ہوں ،حیدر قریشی ان تمام مباحث کا مرکزی کردار رہے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء میں جب ماہیا نگاری کے اس نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا تب سے حیدر قریشی اس میں تخلیقی اور تحقیقی وتنقیدی ہر لحاظ سے سب سے زیادہ اہم اور متحرک کردار ادا کر رہے ہیں۔تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو ممتاز عارف نے سب سے پہلے ''اوراق'' میں اس طرف توجہ دلائی تھی کہ تین ہم وزن مصرعوں پر مشتمل اردو ماہیے، پنجابی ماہیے کی روایت پر پورا نہیں اتر رہے۔یہ اگست ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔تب ہی حیدر قریشی بیک وقت ماہیا نگاری اور اس کی تحقیق و تنقید کی طرف متوجہ ہوئے۔ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' لاہور کے نومبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں ان کے ماہیے شائع ہوئے۔جنہیں اردو ماہیے کے نئے اور باقاعدہ دور کی تخلیقی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔دسمبر ۱۹۹۰ء میں ان کا خط ''اوراق'' میں شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا:

''ممتاز عارف نے اپنے خط میں ماہیے کے وزن کا مسئلہ اٹھایا ہے جو خاصا وزن رکھتا ہے۔میرا خیال ہے کہ ہمارے ماہیا نگاروں کو باہم طے کر لینا چاہئے کہ انہیں اردو ماہیے کو اصل پنجابی ماہیے کی طرح رکھنا ہے یا اس کا حشر بھی ہائیکو جیسا کرانا ہے''۔

اس خط کے بعد حیدر قریشی نے ماہیے کے لوک خدوخال کو ابھارنے کی سعی کرتے ہوئے اسے اردو میں متعارف کرایا،اپنے مثالی نمونوں سے ان کی درست اردو صورت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مساعیٔ جمیلہ سے دیکھتے ہی دیکھتے اردو ماہیا پاکستان کے اردو شاعروں سے نکل کر انڈیا کے پنجاب، مہاراشٹر، راجستھان، بہار،مغربی بنگال، گجرات ،یو پی ،آندھرا پردیش اور متعدد دیگر صوبوں تک پھیل گیا۔پھر بات برصغیر سے باہر نکلی ۔جرمنی،انگلینڈ،امریکہ،کینیڈا،ناروے،اٹلی،ہالینڈ اور دیگر مغربی ملکوں میں رہنے والے شعراء نے بھی ماہیے کہنا شروع کر دیئے۔اور ان میں سے متعدد کے ماہیوں کے مجموعے بھی شائع ہو گئے۔اردو ویب سائٹس پر ماہیے کے لئے سیکشن بنائے جانے لگے اور اردو ماہیے کی سی ڈی

بھی جاری ہوگئی۔ادبی رسائل کے ماہیا نمبرز شائع ہوئے۔میں یہاں اردو ماہیے کی اب تک کی پیشرفت اوراس کے مستقبل کے امکانات پر بات نہیں کرنا چاہتا کہ اس طرح مضمون بہت پھیل جائے گا۔میرا مقصد اردو ماہیا نگاری کے سلسلے میں حیدر قریشی کی اب تک کی کارکردگی اور خدمات کا تھوڑا سا ذکر کرنا ہے۔اردو میں ماہیے کی تحقیق اور تنقید کے سلسلے میں حیدر قریشی کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ا۔اردو میں ماہیا نگاری، ۲۔اردو ماہیے کی تحریک، ۳۔اردو ماہیے کے بانی۔۔ہمت رائے شرما

پہلی کتاب تحقیق وتنقید کی یک موضوعی کتاب ہے۔جبکہ باقی دونوں کتابیں ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ان کے بعد بھی حیدر قریشی کے متعدد مضامین اور طویل خطوط شائع ہو چکے ہیں جن میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی ہے اور معترضین کے اعتراضات کے مدلل جواب بھی دیئے ہیں۔ متعدد ماہیا مجموعوں کے پیش لفظ حیدر قریشی کے تحریر کردہ ہیں۔ان کو ماہیا کی عملی تنقید کہا جا سکتا ہے۔

اردو میں ماہیا نگاری سے اردو ماہیے تک۔۔۔۔حیدر قریشی نے تحقیقی طور پر ایک سفر کیا ہے۔ایسا سفر جس سے ان کے ذہنی ارتقا کا پتہ بھی چلتا ہے اور ان حقائق کا بھی جو ماہیے کے مباحث کے نتیجہ میں مسلسل نمایاں ہو کر سامنے آتے چلے گئے اور حیدر قریشی کے موقف کو مزید تقویت دیتے رہے۔''اردو میں ماہیا نگاری'' تک درست اردو ماہیے کے جو پرانے نمونے دستیاب تھے وہ قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے فلمی ماہیے تھے۔''اردو ماہیے کی تحریک'' تک ان دونوں سے پہلے ہمت رائے شرما اور قتیل شفائی کے فلمی ماہیے بھی دریافت ہو چکے تھے۔یہ سارے فلمی ماہیے جو محض لکھے نہیں گئے تھے بلکہ گائے گئے تھے اور ماہیے کی لوک لَے کو مدِ نظر رکھ کر گائے گئے تھے،سب کے سب حیدر قریشی کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔اس دوران چراغ حسن حسرت کے''مبینہ ماہیوں'' کا چرچا کیا جانے لگا،حالانکہ حیدر قریشی نے اپنی پہلی کتاب کے باب''اردو میں ماہیا نگاری کی ابتداء'' کا آغاز ہی چراغ حسن حسرت کے نام اور کام سے کیا ہے اور اس بارے میں اپنے موقف کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ماہیے کے مخالفین سے جب اور کچھ نہیں بنا تو ماہیا نگاری کے ابتدائی نقوش کی تلاش میں چراغ حسن حسرت کو ہمت رائے شرما کی جگہ اوّلیت کا تاج پہنانے کی کوشش کی گئی۔تب حیدر قریشی نے اپنے دو مضامین☆ میں خصوصی طور پر ہمت رائے شرما کی اولیت کو دستیاب حقائق کی بنیاد پر ثابت کیا۔اسی دوران انہوں نے خود حمید نسیم کی ''ناممکن کی جستجو'' کے حوالہ سے ایک نکتہ نکالا جس سے لگتا تھا کہ چراغ حسن حسرت نے اپنے مساوی الوزن ماہیے جنوری ۱۹۳۶ء میں لکھے تھے۔اس طرح ہمت رائے شرما کے اوّلین ماہیے کہنا ۱۹۳۷ء میں ثابت ہوتا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ہی حیدر قریشی نے ایک کتاب کے حوالے سے زمانی لحاظ سے بھی ہمت رائے شرما کو فوقیت دے دی۔وہ کتاب ہے''مسلم انڈینز آف بائیوگرافیکل ڈکشنری'' از احمد سعید ہیڈ

آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری۔ایم اے او کالج لاہور۔اس کے صفحہ نمبر ۳۲۷ کا حوالہ☆☆ دے کر حیدر قریشی نے اپنے موقف کو انتہائی مضبوط بنا لیا ہے۔پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق اردو ماہیے کے وزن کے تعین کے لئے اپنے ابتدائی مضامین میں حیدر قریشی نے یہ موقف اختیار کیا تھا:''ماہیے کی ایک دو نہیں،بیس بحریں بیان کر دی جائیں،ہر وہ بحر ماہیے کی بحر ہے جس میں ماہیا اپنی مخصوص دُھن میں گایا جا سکتا ہے''(''اوراق''لاہور۔نومبر،دسمبر ۱۹۹۳ء۔بحوالہ''اردو ماہیے کی تحریک''صفحہ نمبر ۲۳)

ماہیے کے وزن کی تمام بحث کے بعد وزن کے مسئلہ پر حیدر قریشی کا یہ موقف تا حال حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔پنجابی ماہیے میں پنجابی زبان کی لچک کے حوالے سے اپنی پیش کردہ کئی مثالوں کو بنیاد بناتے ہوئے حیدر قریشی رقمطراز ہیں۔

''ان مثالوں اور سابقہ مضامین کے حوالوں کے بعد ماہیے کے وزن کے سلسلے میں یہ صورتحال سامنے آتی ہے کہ اگر پنجابی ماہیے کے حروف کو اردو عروض کے ضابطوں سے پرکھنے کی کوشش کریں تو دوسرے مصرعوں میں اس قسم کے متضاد وزن ملیں گے۔

ا۔دوسرا مصرعہ پہلے اور تیسرے مصرعوں کے وزن سے دو حروف کم ہوگا۔

۲۔چار حروف کم ہوگا۔ ۳۔مساوی الوزن ہوگا۔ ۴۔دو حروف زیادہ ہوگا۔ ۵۔چار حروف زیادہ ہوگا۔

یہ صرف دوسرے مصرع کی صورتحال ہے۔ریاض احمد نے نشاندہی کی تھی کہ ماہیے کے پہلے اور تیسرے مصرعوں کا وزن بھی اسی طرح کم وبیش ہوتا رہتا ہے۔سو بظاہر ایسی الجھی ہوئی صورتحال میں محض یہ کہہ دینا مناسب نہیں ہے کہ پنجابی ماہیے میں چونکہ دوسرے مصرعہ میں ایک''سبب'' کم وزن والے ماہیے بھی ملتے ہیں اور مساوی الوزن بھی۔لہٰذا اردو میں دونوں طرح کے ماہیے جائز ہیں۔کیونکہ پنجابی حروف کو اردو عروض کے گھیرے میں لینا مناسب نہیں وگرنہ پھر مذکورہ بالا پانچوں قسم کے ماہیے جائز قرار دینا پڑیں گے اور یہ ماہیے کے ساتھ سنگین مذاق ہوگا۔ماہیے کے سلسلے میں جتنا الجھاؤ ہے وہ اس وقت ایک دم ختم ہو جاتا ہے جب ہم ماہیے کو اس کی لَے سے سمجھتے ہیں۔پنجابی ماہیے کی لَے کو آسانی سے اردو عروض کے گھیرے میں لیا جا سکتا ہے اور اس لَے کی رُو سے ماہیے کا پہلا اور تیسرا مصرعہ تو مساوی الوزن ہوتے ہیں جبکہ دوسرے مصرعہ کا وزن ایک''سبب'' کم ہوتا ہے۔'' (اردو ماہیے کی تحریک۔صفحہ نمبر ۱۳۲)

ماہیے کی بحث میں جب دیکھا گیا کہ حیدر قریشی کے موقف کو بڑے پیمانے پر پذیرائی ملنے لگی ہے تو مخالفین نے اپنے مختلف مقاصد کے تحت ماہیے کی تحریری ہیئت کے مسئلے کو اچھالنے کی کوشش کی اور اصرار کیا کہ ماہیا کو ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں لکھا جانا چاہئے۔اس سلسلے میں حیدر قریشی کے تین مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔''اردو ماہیے کی تحریک'' اور''پنجابی لوک گیت۔ماہیے کی تحریری ہیئت'' یہ دونوں مضامین

ان کی کتاب ’’اردو ماہیے کی تحریک‘‘ میں شامل ہیں جبکہ تیسرا مضمون ’’ماہیے کی بحث‘‘ ’’اوراق‘‘ لاہور کے جولائی ،اگست ۱۹۹۹ء کے شمارے میں دستیاب ہے۔ان تینوں مضامین سے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ماہیے کی بحث کے آخری مرحلے میں وزن کے مسئلے پر اپنی ناکامی اور حیدر قریشی کے موقف کی پذیرائی سے ان کے مخالفین نے مل کر اس شوشہ کو چھوڑا اور اس میں وہ سب لوگ شامل تھے جو خود سارے مصرعے مساوی الوزن رکھ کر سہ مصرعی ماہیے کہہ چکے تھے۔چنانچہ ڈیڑھ مصرعی شوشے کے سب سے جارح معترض پرویز بزمی نے ’’اوراق‘‘ کے جنوری فروری ۱۹۹۹ء کے شمارے میں اپنے تیروں کا رُخ صرف حیدر قریشی اور ان کے ساتھیوں کی طرف کئے رکھا۔تینوں مصرعے ہم وزن لکھنے والوں کو میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔لیکن جیسے ہی حیدر قریشی نے ’’اوراق‘‘ کے جولائی اگست ۱۹۹۹ء کے شمارے میں ان کے مضمون کا پوسٹ مارٹم کر کے اصل حقائق کو آشکار کیا،موصوف نے ’’اوراق‘‘ کے صفحات پر پھر اس بحث کو آگے بڑھانے کی جرات نہیں کی۔بہر حال سہ مصرعی اور ڈیڑھ مصرعی تنازعہ میں مذکورہ بالا تینوں مضامین کی رُو سے حیدر قریشی کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ ماہیا ایک لوک گیت تھا۔اسے پنجاب میں لکھنے کا کوئی رواج نہ تھا۔یہ صرف گائی جانے والی لَے تھی۔جب انگریزوں نے برصغیر میں آکر یہاں کے لوک گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کیا تب ماہیے بھی احاطہءتحریر میں لائے گئے۔شروع میں پورا ماہیا ایک ہی لائن میں لکھ دیا جاتا تھا۔پھر اسے ڈیڑھ مصرعہ میں بھی لکھا جانے گا۔اور تین مصرعوں کی صورت میں بھی لکھا جانے لگا۔اس لئے کسی خاص ہیئت کو ماہیے کی تحریری ہیئت قرار دے کر باقیوں کو رد کرنے کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے پنجابی ادبی بورڈ لاہور،اکادمی ادبیات پاکستان اور لوک ورثہ کے قومی ادارہ کی جانب سے شائع کی جانے والی ان کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے جو پنجابی ماہیے کے انتخاب ہیں اور ان سب میں پنجابی ماہیے کو ڈیڑھ مصرعی نہیں بلکہ سہ مصرعی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔حیدر قریشی نے ’’اوراق‘‘ کے شمارے جولائی،اگست ۱۹۹۹ء میں اپنے سہ مصرعی موقف کی تائید میں پنجابی اسکالرز میں سے تنویر بخاری،ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری،علامہ غلام یعقوب انور،ڈاکٹر روشن لال آہوجہ،فارغ بخاری اور امین خیال جیسے ممتاز لوگوں کے حوالے دے کر اپنے موقف کو مزید تقویت دی ہے۔اس کے باوجود وہ تینوں ہیئتوں میں سے کسی کو ازخود،رد کرنے کے بجائے یوں رقمطراز ہیں۔

’’کسی ایک کو قبول کر کے باقیوں کو رد کرنے کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔سہ مصرعی ہیئت کے بارے میں یہ ضرور کہوں گا کہ اب ماہیے کی لَے سے اس کے اتار چڑھاؤ کی تین حالتوں کی نشاندہی کے بعد شواہد اس کے حق میں زیادہ ہو گئے ہیں۔گویا (۱) لَے کی تین حالتوں کی بنیاد پر، (۲) سہ مصرعی ہیئت میں زیادہ ہرا بھرا دِکھنے کی بنیاد پر، (۳) پنجابی میں سہ مصرعی ہیئت کے بیشتر نمونوں کی بنیاد پر، اور (۴) اردو میں مقبولیت کی بنیاد پر ماہیے کی سہ مصرعی ہیئت ہی مروّج ہیئت بنتی ہے۔اس کے باوجود اگر کوئی ماہیا نگار اصل وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہیے کو ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں لکھے، چاہے ایک ہی لمبے مصرع کی ہیئت میں لکھے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ماہیا نے جس طرح اپنی لَے کے ذریعے اپنے وزن کا تعین خود کیا ہے ویسے ہی اس کی تحریری ہیئت بھی اس کی لَے کے ذریعے سے خود بخود رائج ہوتی جائے گی۔جو ہیئت اسے مناسب نہیں لگے گی از خود قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر بے جا اصرار کرنے والوں کو بھی اس کا یقین ہونا چاہئے۔‘‘

اس اقتباس کے آخری جملہ سے حیدر قریشی کا اپنے موقف پر اعتماد اور بے جا مخالفت کرنے والوں کی علمی بے بسی از خود ظاہر ہوئی جاتی ہے۔چنانچہ بعد میں بقول حیدر قریشی ’’پرویزی حیلوں‘‘ سے کام لینے والے کسی مخالف کو اس مسئلہ کو علمی رنگ میں آگے بڑھانے کی توفیق نہیں ملی۔پھر انہوں نے ایک اور رنگ میں مخالفت کا رستہ نکالا۔حیدر قریشی کے ماہیوں پر حملہ کر دیا گیا۔اس مرحلہ میں یورپ سے اردو کی ایسی شخصیات بھی شامل تھیں جن کے دامن میں ایسے مطبوعہ بے وزن شعری مجموعے آن ریکارڈ ہیں جو چھپائے جانے کے باوجود چھُپ نہیں سکے تھے۔اور متعدد جعلی شاعر اور ادیب بھی اس کھیل میں شریک تھے۔اس مہم اور اس کے جملہ مواد کو برادرم سعید شباب یک جا کر رہے ہیں اور کتابی صورت میں لانا چاہتے ہیں اس لئے میں اس سے قطع نظر کرتے ہوئے یہاں حیدر قریشی کے ماہیوں کا تھوڑا سا انتخاب پیش کر دیتا ہوں۔آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

رائن سے چناب ملا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب ملا

یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
مغرب کی اذان ہوئی

کچھ دل کو ملوک کرو
ویسے چن ماہی
جو چاہے سلوک کرو

(دریائے رائن جرمنی کا مشہور دریا ہے۔)

اک روح تھی سیلانی
چھوڑ کے شہرِ دل
جو ہو گئی ملتانی

بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اُس ایک زمانے میں

نہیں ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

تصویر خیالوں کی
کجلا بھری آنکھیں
’’تفسیر اجالوں کی‘‘

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

تُو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

پھولوں کو پرونے میں
سوئی تو چُبھنی تھی
اس ہار کے ہونے میں

منظر ترے گاؤں کے
گرم دو پہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چُھوٹ گئے

تھے دیس میں پردیسی
آ کے ولایت میں
اب ہو گئے ہیں دیسی

رہ جاتی ہیں تعبیریں
خواب ہیں ہم شاید
اور اصل ہیں تصویریں

لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

مل مہکی فضاؤں سے
یار نکل باہر
اندر کے خلاؤں سے

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہوولیوں کی

سب صبحوں کا تاج ہوئی
رحمتِ عالمؐ کو
جس شب معراج ہوئی

ایسے ماہیوں کے تخلیق کار پر اعتراضات کی نوعیت کوئی بھی ہو، مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ مخالفین نے جن حوالوں سے حیدر قریشی پر اعتراض کئے تھے، کل کو وہی حوالے نئے ماہیے لکھنے والوں کے لئے سندِ جواز قرار پائیں گے۔ حیدر قریشی اردو ماہیے کا ایک ایسا مستند نام ہے کہ کل کو ماہیا ادب کا مستقل حصہ بنے نہ بنے اس کے لئے حیدر قریشی کی خدمات ادب کا مستقل حصہ رہیں گی۔ نقصان والی ایک ہی بات ہے کہ ان کی ماہیے کے لئے خدمات اتنی نمایاں ہوئی ہیں کہ ان کی متعدد دوسری اصناف ادب میں بہت ہی اہم ادبی خدمات کسی حد تک پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ حیدر قریشی نے جن دوسری اصناف ادب کو چھوا ہے ان میں بھی ان کی خدمات بہت اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔☆☆

☆مضمون ا''اردو ماہیے کے بانی۔۔۔ہمت رائے شرما''۔۔مضمون۲''اردو ماہیے کے بانی، ہمت رائے شرما۔فلم خاموشی اور تحقیقِ مزید (بحوالہ کتاب اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما۔مطبوعہ دہلی، ۱۹۹۹ء)

☆☆مضمون ''مرزا صاحب کے جواب میں'' (مطبوعہ ''جدید ادب'' جرمنی۔اشاعت مئی ۲۰۰۰ء)

☆☆

''ماہیے کا مستقبل نہایت تابناک ہے اور اس میں حیدر قریشی کے ماہیے اور ان کا اس کے فروغ کے ضمن میں کردار یقیناً ہمیشہ باقی رہے گا'' (**ہارون الرشید** کے مضمون ''غزلیں، نظمیں، ماہیے ایک مطالعہ'' سے اقتباس بحوالہ **حیدر قریشی کی ادبی خدمات** مرتب: پروفیسر نذر خلیق ص ۱۷۳)

حیدر قریشی (جرمنی)

عمرِ لاحاصل کا حاصل

(مئی ۲۰۰۵ء میں حیدر قریشی کی گیارہ کتابوں کی کلیات کا عوامی ایڈیشن شائع ہوا ہے۔اس میں پیش لفظ کے طور پر شامل حیدر قریشی کی تحریر یہاں پیش کی جا رہی ہے۔حیدر قریشی کی کلیات کی پیش کش کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا بتانا کافی ہے کہ ہمارے ہاں جو شاعری ۴۵۰ سے زائد صفحات پر چھپتی ہے وہ اس کے صرف ۴۶ صفحات میں سمیٹ لی گئی ہے۔اس سے ۲۸۴ صفحات کی شعری و نثری کلیات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔**ارشد خالد**)

میرے پانچ شعری مجموعے اور چھ نثری مجموعے اس عوامی ایڈیشن میں شامل ہیں۔گیارہ کتابوں کی مجموعی ضخامت بارہ سو صفحات سے زائد بنتی ہے۔تاہم اس عوامی ایڈیشن میں وہ سارا میٹر ۲۸۴ صفحات میں سمیٹ لیا گیا ہے۔اس انداز کی کلیات کی اشاعت شاید پہلی بار کی جا رہی ہے۔مجھے اس کا آئیڈیا ماہنامہ شاعر بمبئی سے ملا ہے۔ابھی تک میں اس رسالہ کو دوسرے اچھے ادبی رسالوں کی طرح دیکھتا تھا۔نومبر ۲۰۰۴ء کے شاعر میں میرا گوشہ شائع ہوا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس سائز اور انداز میں کم سے کم صفحات پر زیادہ سے زیادہ میٹر شامل کیا جا سکتا ہے۔اس احساس کے ساتھ ہی اپنی گیارہ تخلیقی کتابوں کو یکجا کرنے کا خیال آیا۔سو میں نے اس منصوبہ پر کام شروع کر دیا اور اب بارہ سو سے زائد صفحات کا میٹر ۲۸۴ صفحات کی اس کلیات میں پیش خدمت ہے۔برادرم شاہد ماہلی کا شکر گزار ہوں کہ موجودہ کاروباری اور تجارتی دور میں انہوں نے اس بار بھی میرے ساتھ ویسے ہی اخلاص کا اظہار کیا ہے جیسے قبل ازیں میری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی طرف سے ہوتا رہا ہے۔ان کی محبت اور خلوص کے نتیجہ میں ہی اس کلیات کے عوامی ایڈیشن کی اشاعت اتنی آسانی سے ہونے جا رہی ہے۔مجھے امید ہے کہ اس طرح مجھے اپنے پورے تخلیقی کام کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔

چار شعری مجموعے ''سلگتے خواب''، ''عمرِ گریزاں''، ''محبت کے پھول'' اور ''دعائے دل'' کتابی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں اور ان چاروں مجموعوں کی کلیات بھی ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔پانچواں مجموعہ ''درد سمندر'' الگ سے شائع نہیں کیا، البتہ ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے پاکستان سے متوقع نئے ایڈیشن میں اسے بھی شامل کیا ہے۔ان پانچ مجموعوں کے بعد میں نے جو تھوڑی سی

شاعری کی ہے وہ بھی اس عوامی ایڈیشن کلیات میں شامل ہے۔کافی عرصہ پہلے ایک بار چند دوپدے کہے تھے،انہیں بھی ماہیوں کے بعد،شعری حصہ کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔

میرے دوافسانوی مجموعے''روشنی کی بشارت''اور''قصے کہانیاں''،خاکوں کا مجموعہ''میری محبتیں'' اورسفرنامہ''سوئے حجاز'' یہ کتب تو پہلے سے چھپ چکی ہیں البتہ''کھٹی میٹھی یادیں''اورانشائیوں کا مجموعہ''فاصلے قربتیں''ابھی تک الگ سے شائع نہیں ہوئے،یہ دونوں نثری مجموعے پاکستان سے متوقع میری نثری کلیات''افسانے،خاکے،یادیں،انشائیے''میں شامل کئے جا چکے ہیں اوراس عوامی کلیات میں بھی شامل کئے جا رہے ہیں۔اس سب کے ساتھ ماریشس کی ایک کانفرنس کا رپورتاژ بھی یادوں والے حصہ میں ہی شامل کر دیا ہے۔تمام تخلیقات کے آخر میں پروفیسر نذر خلیق کا انٹرنیٹ مکالمہ اس وجہ سے شامل کرلیا ہے کہ یہ مکالمہ زیادہ تر انہیں تخلیقات کے حوالے سے ہوا ہے۔تخلیقی حوالے سے یہ گیارہ کتب اور کچھ اضافی تحریریں میرا اب تک کا اثاثہ ہیں۔داغِ ندامت سمیت بہت سارے داغ ملامت (اورتھوڑی سی نیکیاں) میری لاحاصل زندگی کا حاصل ہیں،انہیں آپ میری تخلیقات میں بخوبی دیکھ سکیں گے۔میں نے ایک بار اپنے آپ سے کہا تھا۔

خوشی کے لمحے لکھو،عمرِ اضطراب لکھو نکالو وقت کبھی عشق کا حساب لکھو

حساب کتاب تو مجھے کبھی نہیں آسکا پھر بھی ان گیارہ کتابوں میں کچھ بے ترتیب سا حساب ضرور آ گیا ہے۔اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے ادب کے قارئین کے لیے اپنا یہ اثاثہ پیش کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہورہی ہے۔مجھے یقین ہے کہ میرے قارئین میرے اس تخلیقی سفر میں کسی نہ کسی سطح پر اپنی شرکت محسوس کریں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ ماہیے کی تحقیق وتنقید پر مشتمل میری پانچ کتب کی کلیات الگ سے ترتیب دی جا رہی ہے۔ان میں سے تین کتب پہلے سے مطبوعہ ہیں جبکہ دو کتب کا سارا میٹر تو رسائل اور کتب میں چھپ چکا ہے لیکن الگ سے کتابی صورت میں ابھی شائع نہیں ہوا۔تحقیق اور تنقید کا وہ سارا کام الگ منصوبہ کے تحت زیرِ ترتیب ہے۔حالاتِ حاضرہ پر میرے تاثرات کا مجموعہ''منظر اور پس منظر'' بھی الگ سے چھپا ہوا موجود ہے۔باقی جو تھوڑا بہت بکھرا ہوا کام ہے،زندگی رہی اور توفیق ملی تو اسے بھی اپنی زندگی میں ہی سمیٹ لوں گا ورنہ دوست احباب اور محققین کے لئے بھی کچھ کام رہنے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

سرِ دست میں اپنا اب تک کا سارا تخلیقی نوعیت کا کام اس عوامی ایڈیشن کی صورت میں پیش کر رہا ہوں،اپنے قارئین کے ردِ عمل کا منتظر رہوں گا! ☆☆

ارشد خالد (راولپنڈی)

حیدر قریشی۔۔شخص وعکس

(ان کوائف کی تیاری میں سعید شباب اورنذیر فتح پوری کے ترتیب دیئے ہوئے کوائف سے اور ماہنامہ کائنات (اردو دوست ڈاٹ کام) کے شمارہ مئی ۲۰۰۴ء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔)

نام: قریشی غلام حیدر ارشد

قلمی نام: حیدر قریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر ۱۹۵۳ء '

درست خاندانی روایت: ۱۳؍جنوری ۱۹۵۲ء

مقامِ پیدائش: چناب نگر (سابق ربوہ)

آبائی علاقہ: رحیم یار خاں' خان پور (سابق ریاست بھاولپور)

تعلیم: ایم اے (اردو)

ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: شاعری میں۔غزل'نظم'ماہیا

نثر میں: افسانہ'خاکہ'انشائیہ'سفرنامہ'یادنگاری'تحقیق وتنقید

جُملہ کتب کی تفصیل: شاعری:

سلگتے خواب (غزلیں)' ناشر: تجدید اشاعت گھر۔لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۱ء

عمرِ گریزاں (غزلیں'نظمیں اور ماہیے)' ناشر: تجدید اشاعت گھر لاہور،اسلام آباد۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء

محبت کے پھول (ماہیے)' ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔خانپور۔مطبوعہ ۱۹۹۶ء

دعائے دل (غزلیں'نظمیں) ناشر: نصرت پبلشرز لاہور۔مطبوعہ ۱۹۹۷ء

چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں' نظمیں' ماہیے** ناشر: سرور ادبی اکادمی۔جرمنی۔مطبوعہ ۱۹۹۸ء

درد سمندر (غزلیں'نظمیں اور ماہیے) یہ مجموعہ کلیات 'عمر لاحاصل کا حاصل' میں شامل کیا گیا ہے۔

تخلیقی نثر:

روشنی کی بشارت(افسانے) ناشر: تجدید اشاعت گھر، اسلام آباد، لاہور۔ مطبوعہ ۱۹۹۲ء

قصے کہانیاں(افسانے) یہ مجموعہ الگ سے نہیں چھپا۔ **افسانے** میں شامل ہے۔

افسانے (روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں ایک جلد میں)' ناشر: معیار پبلی کیشنز دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء

ایٹمی جنگ(تین افسانے اردو اور ہندی میں) ناشر: معیار پبلی کیشنز دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء

میں انتظار کرتا ہوں(افسانوں کا ہندی ترجمہ) ناشر: ساہتیہ بھارتی، دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء

میری محبتیں(خاکے)' ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔ خانپور۔ مطبوعہ ۱۹۹۶ء

میری محبتیں(خاکے)، ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔ مطبوعہ ۱۹۹۸ء

کھٹی میٹھی یادیں(یادنگاری) یہ الگ سے شائع نہیں کی، عمرِ لا حاصل کا حاصل میں شامل ہے

سُوئے حجاز(سفرنامہ۔ عمرہ کا احوال)' ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۰ء

سُوئے حجاز(سفرنامہ، سفرِ حج کے اضافہ کے ساتھ)، ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی۔ مطبوعہ ۲۰۰۴ء

فاصلے، قربتیں(انشائیے) یہ الگ سے شائع نہیں کی، 'عمرِ لا حاصل کا حاصل' میں شامل ہے

عمرِ لاحاصل کا حاصل مذکورہ بالا پانچ شعری مجموعوں اور چھ نثری مجموعوں کی عوامی کلیات

ناشر: معیار پبلی کیشنز۔ دہلی۔ مطبوعہ ۲۰۰۵ء

منظر اور پس منظر(9/11 کے بعد حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے فکر انگیز کالموں کا مجموعہ)

ناشر: سرور ادبی اکادمی جرمنی اور www.urdustan.com مطبوعہ ۲۰۰۴ء

تحقیق و تنقید:

ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت(مضامین) ناشر: نایاب پبلی کیشنز۔ خانپور مطبوعہ ۱۹۹۵

اردو میں ماہیا نگاری(تحقیق وتنقید) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔ اسلام آباد۔ مطبوعہ ۱۹۹۷ء

اردو ماہیے کی تحریک(مضامین) ناشر: فرہاد پبلی کیشنز۔ راولپنڈی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما(مضامین) ناشر: معیار پبلیکیشنز دہلی۔ ۱۹۹۹ء

اردو ماہیا(ماہیے کے مجموعوں کے پیش لفظ۔ زیرِ اشاعت)

ماہیے کے مباحث(مضامین۔ زیرِ اشاعت)

اردو ماہیا تحقیق و تنقید(ماہیے کی تحقیق وتنقید کی پانچ کتابیں ایک جلد میں زیرِ ترتیب ہیں)

ادارت : ادبی رسالہ ''**جدید ادب**'' خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔ یہی جریدہ اب جرمنی سے جاری کیا ہوا ہے۔ یہ رسالہ کتابی صورت کے ساتھ انٹرنیٹ پر اس سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔

www.jadeedadab.com

ویب سائٹ: خورشید اقبال، نذر خلیق اور سعید شباب کی ترتیب دی ہوئی ایک ویب سائٹ قائم ہے۔

www.haiderqureshi.com

اس ویب سائٹ پر حیدر قریشی کی بیشتر کتب موجود ہیں، مزید میٹر بھی اپ لوڈ کیا جا رہا ہے۔ ابھی تک آج کے ادباء میں سے کسی بھی اردو ادیب کی یہ سب سے بڑی اور معیاری ویب سائٹ ہے۔

اس کے علاوہ اس ویب سائٹ پر حیدر قریشی کا حالاتِ حاضرہ پر فکر انگیز اور مستقل نوعیت کے کالموں کا مجموعہ **منظر** اور **پس منظر** موجود ہے۔ www.urdustan.net

ادبی اعتراف

حیدر قریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔حیدر قریشی فکر و فن

مصنف: **محمد وسیم انجم** (مطبوعہ ۱۹۹۹ء)

ناشر: انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر ۳، راولپنڈی۔ پاکستان

۲۔حیدر قریشی فن اور شخصیت

مرتبین: **نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے** (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔ پُونہ، انڈیا

۳۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات

مرتب: **پروفیسر نذر خلیق** (مطبوعہ ۲۰۰۳ء)

ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔ خانپور۔ پاکستان

۴۔حیدر قریشی شخصیت اور فن

منزہ یاسمین کا تحقیقی مقالہ

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۵۔حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز

مرتب: **سعید شباب** (مطبوعہ ۲۰۰۴ء)

ناشر: نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ ایمسٹرڈیم۔ ہالینڈ

٦۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدر قریشی نمبر

مرتب: **ارشد خالد**

ناشر: عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد (کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

حیدر قریشی پر ترتیب دیئے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ ''**اسباق**'' پونہ شمارہ: فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء ایڈیٹر: نذیر فتح پوری

۲۔اشاعتِ خصوصی ''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ/حیدر قریشی''

ہفت روزہ **ہوٹل ٹائمز** اسلام آباد ۲۲مئی تا ۲۸مئی ۱۹۹۸ء مرتبین: اختر رضا کیکوٹی و محمد وسیم انجم

۳۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ سہ ماہی ''**ادبِ عالیہ**'' وہاڑی۔شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء

ایڈیٹرز: ریاض ہانس و ریاض ملک

۴۔خصوصی مطالعہ ''**مہرِامروز**'' مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی ۲۰۰۴ء (اردو دوست ڈاٹ کام)

ایڈیٹر: خورشید اقبال

۵۔گوشۂ حیدر قریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء ایڈیٹر: افتخار امام صدیقی

پاکستان اور جرمنی سے باہر کے اسفار

ہندوستان۔سعودی عرب۔انگلینڈ۔ہالینڈ۔فرانس۔ماریشس۔آسٹریا۔بلجیم۔

حیدر قریشی کا ڈاک کا پتہ:

Haider Qureshi

Rossertstr.6, Okriftel,

65795 Hattersheim, Germany.

ٹیلی فون نمبر: **0049-6190-930078**

ای میل: **hqg786@arcor.de**

☆☆

''مجھے پہلے کی طرح آپ کے کام کی صلاحیت کے معجزے پر حیرت بھی ہے اور صد رشک بھی۔سمجھ میں نہیں آتا ہے آپ 24 گھنٹوں کو 48 گھنٹوں یا اس سے بھی زیادہ کس طرح بنا لیتے ہیں؟ اگلی ملاقات ہوگی (انشاءاللہ) تو آپ سے یہ منتر سیکھنے کی کوشش کروں گی'' **ڈاکٹر لڈمیلا** (ماسکو) **بنام حیدر قریشی** مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی۔شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء۔ص ۲۰)

نذیر فتح پوری (پونہ)

ایک تاثر،ایک احساس

ایک ادھوری تحریر حیدر قریشی کے نام

ادب کے میدان میں،زندگی کے میدان میں حیدر قریشی ایک فاتح کے روپ میں نظر آتے ہیں۔آپ انہیں دور سے دیکھیں یا قریب سے،غزلوں میں دیکھیں یا افسانوں میں،نظموں میں دیکھیں یا ماہیوں،خاکوں میں دیکھیں یا خطوط میں،تبصروں میں دیکھیں یا مضامین میں،وہ ہر جگہ فتح کا علم اٹھائے ،زیرلب مسکراتے ، ایک شانِ بے نیازی سے رواں دواں نظر آتے ہیں۔تکان، پژمردگی اور تساہل کا احساس تک ان کو چھو کر نہیں گزرتا۔وہ جب بھی لکھتے ہیں تخلیقی سچ لکھتے ہیں اور تخلیقی سچائی کے بیان میں نمایاں اور قابلِ ذکر مرحلوں کو سر کرتے چلے جاتے ہیں۔ہوا میں لفظ اچھال کر وہ اپنا اور اپنے قاری کا وقت ضائع نہیں کرتے۔حرف کی حرمت کا انہیں شدید احساس ہے۔لفظ کی توقیر کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔روشنی اور روشنائی دونوں کا زیاں کرنے سے گریز کرتے ہیں۔حیدر قریشی آدھے لفظوں کی روشنائی سے لکھنے کے قائل نہیں، پوری تاب و توانائی کے ساتھ، پورے تخلیقی سچ اور بھرپور صداقت کے ساتھ وہ پورے لفظوں میں جرأت کے ساتھ اپنا ادبی اظہار کرتے ہیں۔

ادب میں اختلاف رائے کی بڑی گنجائش ہے۔اردو ماہیے کے درست وزن کو رائج کرنے کے سلسلے میں وہ انڈو پاک دونوں جگہ شدید مخالفت کا شکار ہوئے۔جرمنی میں جہاں وہ مقیم ہیں ان کے خلاف انتہائی پست سطح کی محاذ آرائی کی گئی۔ناطقہ بند کرنے والوں نے بے پناہ زور آزمائی کی، لیکن وہ حیدر قریشی کی شخصیت کو، ان کی سوچ کو اور ان کے افکار کو قید نہیں کر سکے۔آج اکثر مخالفین یا گھسی ہوئی مخالفت لکیر پیٹ رہے ہیں یا سینہ کوبی میں مبتلا ہیں اور کچھ مخالفین شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے ہیں۔حیدر قریشی ماہیے کے معرکے میں فتح یاب ہو چکے ہیں۔ماہیا نگاروں کی بھاری اکثریت ان کے ساتھ ہے۔کثرت میں وحدت کا منظر مرتب ہو چکا ہے۔ماہیے کے فروغ کے لیے ایک تخلیقیت پرور ماحول اپنی تاب و توانائی کے ساتھ

پرورش پا رہا ہے۔اپنی کامیابیوں پر حیدر قریشی خوش ضرور ہیں لیکن وہ خوشیوں کا بے جا اظہار نہیں کرتے۔کبر ونخوت کا اظہار ان کی کسی ادا سے بھی نہیں ہوتا۔وہ اپنے حاسدوں کو ایسی خشک لکڑیاں سمجھتے ہیں جو ان کے اندر تخلیق پرور آگ کو ہمیشہ زندہ اور پُر نور رکھتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ حیدر قریشی سے آج تک براہِ راست ملاقات کا موقع مجھے نہیں ملا ہے۔پچھلے دس بارہ برسوں میں اپنے خطوط کے ذریعہ،اپنی کتابوں کے ذریعہ،اپنے مضامین کے ذریعہ،ان کی شخصیت جس طرح مجھ پر روشن ہوئی ہے اسی روشنی کو رہنما بنا کر یہ تاثر قلمبند کر رہا ہوں۔حیدر قریشی منتشر خوابوں ،ڈوبتے منظروں اور گم ہوتی ہوئی منزلوں کو پکڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ تتلیوں کا تعاقب کرنے والوں کو ان کا بچپنا واپس نہیں ملتا۔وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ کے چہرے پر چاہے جتنا ملمع چڑھایا جائے سچ کے سامنے اس کی رونق ماند پڑ ہی جاتی ہے۔قلعی بہر حال قلعی ہوتی اور کھلنا اس کا مقدر ہے۔جب قلعی کھل جاتی ہے تو اصلی اور نقلی کی پہچان آسانی سے ہو جاتی ہے۔

گھنی نیند سوئی ہوئی خموشی کو چٹکی بھر کر اٹھانا،سناٹے کو گونج عطا کرنا،بنجر زمینوں میں ہل چلانا،ویرانوں میں پھول کھلانا،اُس طرف جانا جس طرف کوئی نہیں جاتا،اور اُس طرف نہیں جانا جس طرف سب جاتے ہیں۔منزلوں کا سراغ نکالنا،راستوں کو ہموار کرنا،ہوا کو پکڑنا،سمندر کو تسخیر کرنا،نمیدہ ریت پر زندگی کی اَن کہی اور اَن لکھی کہانیوں کو نقش کرنا۔صحرا کو گل و گلزار بنانا،درو دیوار پر سبزہ اگانا،آنکھوں کو اَن دیکھے منظر دکھانا،ذہنوں کو اَن سوچی سوچ دینا،بے رنگ خاکوں میں رنگ بھرنا،بے چہرگی کو چہرا عطا کرنا،جذبات کا احترام کرنا،رشتوں کا اکرام کرنا،دوسروں کو زخم نہ لگانا،پرائے زخموں پر مرہم رکھنا،شعر کہتے وقت خود تڑپنا،شعر کہہ کر قارئین کو اطمینان وسکون عطا کرنا،دل کی خانقاہ میں عقیدتوں کی مشعل روشن کرنا،اندھیرے کو مٹاتے ہوئے روشنی کی بشارت دینا۔روایتوں کا احترام کرنا،نئ ہواؤں کے لیے ذہن کھلا رکھنا،درد کو ماہیا بنانا،احساس کو شعر بنانا،نالوں کو نغمگی عطا کرنا،تکلم میں تبسم پیدا کرنا،تبسم میں تکلم پیدا کرنا،مخطوطوں کی حفاظت کرنا،عہد ناموں پر دستخط کرنا،یہ اور ایسی دوسری بے شمار خوبیوں سے ان کی زندگی کی کتاب بھری پڑی ہے۔قاری جس ورق سے چاہے اس کتاب کا مطالعہ کر سکتا ہے۔کہیں جھول،ابہام یا ژولیدگی محسوس نہیں ہوگی۔سارا،سب کچھ فرفر پڑھا جائے گا۔ادب کا بھرپور خزانہ،زندگی کا بھرپور احساس حیدر قریشی کی زندگی کی کتاب میں سطر سطر پر درج ملے گا۔

میں قلم کو روک رہا ہوں۔ابھی کاغذ بھی میرے سامنے پھیلا ہوا ہے،قلم میں روشنائی موجود ہے،ذہن میں اس تاثر کے لیے ابھی جملوں کا انبار لگا ہوا ہے۔۔۔تاثر ابھی باقی ہے۔۔۔۔

☆☆

عارف فرہاد کی

حیدر قریشی سے گفتگو

عارف فرہاد ۲۰۰۴ء میں جرمنی گئے تھے۔وہاں انہوں نے ۲۶؍ستمبر کو حیدر قریشی سے انٹرویو کیا تھا۔یہ انٹرویو فورم انٹرنیشنل جرمنی میں چھپ چکا ہے لیکن ایک تو وہ رسالہ ادبی رسالہ نہیں بلکہ سوشل میگزین ہے دوسرے اس مطبوعہ انٹرویو میں کمپوزنگ کی بعض اغلاط رہ گئی تھیں جن سے گفتگو کا نفسِ مضمون متاثر ہوا تھا اس لیے اس انٹرویو کو نظر ثانی کے بعد اس نمبر میں شامل کیا جا رہا ہے(**ارشد خالد**)

حیدر قریشی کی ہمہ جہت شخصیت ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔اخبارات اور جرائد کے لئے اب تک اُن کے کئی انٹرویوز لئے جا چکے ہیں مگر اِن میں سے بیشتر آن لائن یا بذریعہ ڈاک منگوائے گئے۔گزشتہ دنوں مجھے یورپ کے دورے میں ان سے تفصیلی ملاقاتوں کا موقع ملا تو میں نے ’’فورم انٹرنیشنل‘‘ کے لئے ان کا خصوصی انٹرویو لیا۔ان کے ادبی کام کے تو ہم سب پہلے سے ہی معترف تھے مگر جرمنی میں ان سے بالمشافہ ملاقاتوں سے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ حیدر قریشی نہ صرف اپنی تخلیقات کی طرح سچے،کھرے اور متوازن ہیں بلکہ ایک خوش مزاج،نفیس اور شائستہ آدمی ہیں۔

عارف فرہاد: برادرم حیدر قریشی صاحب،ہمیں کچھ اپنے ابتدائی حالات کے بارے میں بتائیے؟

حیدر قریشی : عارف فرہاد صاحب!میری زندگی کا آغاز رحیم یار خان سے ہوا تھا اور بچپن کا آدھا حصہ وہاں گذارا،اس کے بعد ہم لوگ خانپور شفٹ ہو گئے اور خانپور میں ہی زندگی کا باقی حصہ گذارا۔کہیں نہ کہیں چھوٹے چھوٹے پڑاؤ رہے مگر زیادہ تر خانپور،رحیم یار خان کو ہی شمار کرتا ہوں اور اس کے بعد سے اب تک جرمنی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بتائیے کہ آپ قریشی غلام حیدر ارشد سے حیدر قریشی کیسے بنے؟

حیدر قریشی : یہ کچھ یوں ہوا کہ ہماری ایک عزیزہ تھیں،بزرگ خاتون۔انہوں نے بڑے پیار سے میرے نام کے ساتھ ارشد کا اضافہ کر دیا۔بچپن میں ہی،تو ان کے احترام میں ارشد کا تخلص تو رہنے دیا مگر جب لکھنے کا شوق ہوا تو مجھے لگا کہ یہ نام ادبی طور پر کچھ میچ نہیں کر رہا تو میں نے سوچا کہ مجھے کس طرح کا نام اختیار کرنا چاہئے تو پھر حیدر قریشی مجھے مناسب لگا اور میں نے حیدر قریشی نام اختیار کر لیا۔

عارف فرہاد: جرمنی آنے کا خیال کیسے آیا آپ کو؟

حیدر قریشی : آہ۔ یہ لمبی کہانی ہے اور اس کے لئے ابھی مزید چھ مہینے انتظار کریں۔ اس کے بعد میں جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

عارف فرہاد: تو اب تک آپ نے جو انٹرویوز دیئے ہیں ان میں جرمنی آنے کا واقع سچ تھا یا جھوٹ تھا۔

حیدر قریشی : نہیں جھوٹ کہیں نہیں بولا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کہیں کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کر لی ہو لیکن جھوٹ کہیں نہیں بولا اور ابھی میں ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا اور جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتا بلکہ بعد میں دیانتداری سے بتاؤں گا کہ کیا صورت حال تھی اور کیا Situation تھی۔

عارف فرہاد : یہاں آ کر بھی لکھنا لکھانا جاری رکھا، یہ بتائیے کہ یہاں آ کر آپ کے انداز فکر میں کوئی تبدیلی آئی اور اگر آئی تو اس کی وجہ کیا تھی۔

حیدر قریشی: دیکھیں جی وہ جو کہتے ہیں نا کہ سفر وسیلہء ظفر ہے تو ظاہر ہے کہ پاکستان جیسے معاشرے سے نکل کر یورپ کے معاشرے میں آنا اور اس میں بھی پھر جرمنی جیسے ملک میں آنا تو ذہنی کشادگی کا ایک احساس ہوا ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جو وہاں کے ماحول میں بیٹھ کر کچھ اور طرح دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں آ کر ان میں تھوڑا فرق محسوس ہوا ہے۔ Vision میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی آئی ہے لیکن یہ نہیں کہ میں اپنی جڑوں سے کٹ گیا ہوں۔ میری بنیاد وہی ہے۔ اس بنیاد پر رہتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ میری سوچ میں کچھ وسعت آئی ہے، ذہنی کشادگی ہوئی ہے اور دونوں کا کمبی نیشن آپ میرے ہاں دیکھ سکتے ہیں۔

عارف فرہاد :اس سے پہلے بہت سے احباب آپ سے پوچھ چکے ہیں، آپ نے پہلے شاعری کی یا نثر لکھی، میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جرمنی آ کر آپ نے پہلی غزل، پہلا افسانہ یا پہلا تحقیقی یا تنقیدی کام جو کیا اس کی تفصیل کیا ہے۔

حیدر قریشی: یہ حساب کتاب والی بات تو بالکل اب ذہن میں نہیں ہے لیکن یادداشت کے سہارے جو کچھ فوری طور پر ذہن میں آ رہا ہے پھر وہی بات آ جاتی ہے کہ یادوں کے ساتھ یا اپنی روایت کے ساتھ جڑنے کی چیز جو تھی وہ بڑی شدت کے ساتھ یہاں آ کر ظاہر ہوئی مثلاً ماہیے پر میرا جو بنیادی کام ہے وہ یہاں آ کر شروع ہوا۔ اس کو صرف ماہیے والی بحث نہ سمجھیں۔ ماہیے کی بحث کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ماہیا میرے Locale سے Related چیز ہے یعنی ایک زاویئے سے اس مٹی سے جڑنے کا عمل بھی تھا جہاں میں نے زندگی بسر کی۔ گویا اپنے ماضی یا اپنی روایت کے ساتھ جڑے رہنے کی کیفیت یا خواہش یا جو بھی اس کو آپ کہہ لیں، تو یہ سب از خود آتا چلا گیا، شاعری میں بھی، دوسری

تحریروں میں بھی۔۔ پہلا افسانہ مجھے یاد ہے، میں نے ''مسکراہٹ کا عکس'' لکھا تھا۔ یہ وہ افسانہ ہے جس میں میری خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری ایک دوسرے میں ضم ہو گئی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار میرے والد صاحب ہیں۔ ''اوراق'' میں چھپا تھا یہ افسانہ اور آغا جی نے بہت پسند کیا تھا اسے۔ اس کے باقی کے کردار جو میرے تینوں بیٹے ہیں اور میں۔ یعنی یہ وہ افسانہ ہے جو یہاں آنے کے بعد مجھ سے لکھا گیا۔ اس میں بھی اپنی مقامیت کے ساتھ وابستہ رہنے کی ایک خواہش تھی۔

عارف فرہاد : احمد ندیم قاسمی اور آغا صاحب، دو ادبی ستون ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے قاسمی صاحب کی پہچان ان کا افسانہ اور ان کی شاعری ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ان کی کالم نگاری ہے۔ اسی طرح آغا صاحب کے حوالے سے بھی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی پہچان تنقید ہے۔ کچھ کے خیال میں نظم ہے اور کچھ کے نزدیک ان کی انشائیہ نگاری۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ان دونوں شخصیات کے کس کس کام کو ہم اہمیت دے سکتے ہیں اور ان کی شناخت ٹھہرا سکتے ہیں۔

حیدر قریشی: میرے نزدیک دونوں بزرگوں کے ٹوٹل کام کی بنیاد پر ہی ان کا مجموعی Impact بنے گا۔ ان کو خانوں میں تقسیم کر کے یعنی احمد ندیم قاسمی کی غزل کو ان کے افسانے سے لڑا کے یا آغا جی کی نظم کو ان کی تنقید سے لڑا کے تو وہ آغا جی Verses آغا جی اور قاسمی جی Verses قاسمی جی تو یہ بات نہیں بنے گی۔ ان کے ٹوٹل ورک سے ہی ان کا ٹوٹل Impact بنے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی کسی صنف یا تحریر میں اس قدر مضبوط ہوں کہ دوسری صنف نسبتاً کچھ کم لگے لیکن جو بڑے Artist ہوتے ہیں۔ ان کی کمزور تحریر کا بھی کم از کم کوئی Level ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کم از کم Level جو ہے وہ بہت سوں کے بڑے لیول سے بھی زیادہ ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ کسی ایک حوالے سے ان کی پہچان مقرر کی جائے۔ ہاں آغا جی کے حوالے سے میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ ان کا اکیڈمک لیول اتنا ہائی ہے کہ ان کو تو ابھی تک پاکستان میں صحیح طرح سے سمجھا ہی نہیں گیا اور یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ہاں جو جرنلسٹک ٹائپ کا ادب ہے۔ یہاں میں جرنلزم کے خلاف نہیں بول رہا ہوں۔ جرنلزم کی اپنی ایک اہمیت ہے، افادیت ہے اور اس کا میں بڑا معترف ہوں بلکہ اس سے فیض یاب ہوتا رہتا ہوں لیکن وہ جو ادب میں جرنلسٹک Value کو جس طرح سے لایا گیا ہے اس طرح کے لوگوں نے بھی کچھ خرابی کی ہے۔ آغا جی کی تفہیم ہونے میں۔

عارف فرہاد : یہاں آ کر آپ نے ماہیے پر پہلی مرتبہ تحقیقی وتنقیدی کام کیا۔ نہ صرف خود لکھا بلکہ دوسروں کو بھی تحریک دیتے رہے۔ یوں ماہیا آپ کی شناخت بن چکا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے خود ماہیے کب لکھنا شروع کئے؟

حیدر قریشی: اب مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں، ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی کتاب یا ریفرنس دیکھنا

پڑے گا۔ وہ کون سے دوست تھے جو آپ کے ہم نام بھی تھے ذرا سے۔ ہاں یاد آیا۔ ممتاز عارف۔ انہوں نے اوراق میں ایک خط لکھا تھا اور میرا خیال ہے یہ 1990ء کا کوئی شمارہ تھا جس میں انہوں نے ماہیے کے وزن کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے فوراً بعد اوراق کا اگلا شمارہ آنے سے پہلے میں نے نہ صرف ماہیے لکھے بلکہ ان کے Favour میں ایک خط لکھا اور سب سے پہلے میرے ماہیے ادب لطیف لاہور میں چھپے تھے۔ ادب لطیف کا غالباً 55 سالہ نمبر تھا یا گولڈن جوبلی نمبر، نومبر کا شمارہ تھا شاید۔ اس کے بعد اوراق اور دیگر رسائل میں میرے ماہیے چھپے یعنی جس سال ممتاز عارف صاحب کا خط اوراق میں چھپا، اسی سال میں نے ماہیے لکھے۔

عارف فرہاد : آپ نے نظم بھی لکھی، افسانہ بھی، انشائیہ بھی لیکن اصلاً آپ نے جو تحقیقی وتنقیدی کام کیا وہ ماہیے پر ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے غزل یا نظم پر کیوں نہیں کیا؟

حیدر قریشی: بات یہ ہے کہ میں ماہیے پر اتنا کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا، وہ تو مجھے یار لوگوں نے دھکیلا اس طرف۔ آپ نے لطیفہ سنا ہوگا نا کہ کسی ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لئے ایک صاحب چلے گئے تو جب بچا کر واپس لے آئے تو لوگوں نے انہیں بڑی داد دی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ داد واد بعد میں دیں پہلے یہ بتائیں کہ مجھے دھکا کس نے دیا تھا۔ تو مجھے تو دھکا دیا گیا ہے۔ ایک بڑی سادہ سی اور بڑی صاف سی بات تھی اور میرا خیال تھا سب دوست فوراً بات مان لیں گے کہ بھئی ماہیے کا یہ مسئلہ ہے، یہ پنجابی میں یوں ہے۔ اس کو ذرا گنگناؤ تو یہ ماہیا ہے اور یہ سب کو سمجھ آ جائے گی۔ اس سے کوئی جھگڑا کھڑا نہیں ہوگا مگر لوگوں نے اتنا جھگڑا کھڑا کر دیا اور اس پر اتنی بحث چلی کہ مجبوراً مجھے اس میں Involve ہونا پڑا اور اس طرح سے یہ کام ہوتا چلا گیا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شعبے میں کام کرنے کی اگر آپ کو توفیق ملی ہے تو یہ خدا کا فضل ہے اور وہ جس طرح سے بھی توفیق دے اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ کسی اور صنف میں مجھے کام کرنے کی توفیق مل جاتی تو وہ بھی اس کی مہربانی ہوتی۔ اس میں (ماہیے میں) کام کرنے کا موقع مل گیا تو اسے میں اپنی کوئی کمزوری نہیں سمجھتا ہوں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب، آپ کی ادب میں جو Contribution ہے اس میں ایک حوالہ آپ کے ادبی جریدے جدید ادب کا بھی آ جاتا ہے۔ یہ بتائیے کہ جدید ادب کا آغاز آپ نے کب کیا تھا۔

حیدر قریشی: ہاں یہ میں نے اکتوبر 1978ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع کیا تھا جس میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی تصویر میں نے ٹائٹل پر دی تھی اور بڑا ہی غریبواں سے ہمارا یہ پرچہ تھا، 80 صفحات کا، ایک سال تک ہم کتابی سلسلے کی صورت میں 80 صفحات کا ہی پرچہ نکالتے رہے۔ پھر کچھ تھوڑی سی Development ہوئی۔ خانپور کے دوستوں نے دیکھا کہ کچھ کام ہو رہا ہے تو انہوں نے ساتھ دینا شروع

کیا، پھر اسے ہم نے کچھ ضخیم بھی کیا۔ 500 صفحات تک بھی لے گئے۔ گویا یہ خانپور کا دور جو تھا یہ آٹھ یا نو سالوں کا تھا۔

عارف فرہاد : اچھا یہ بتائیے کہ خانپور کا جو دور تھا اس زمانے میں وہاں کی ادبی فضا یا یہ کہہ لیجئے کہ ان دنوں آپ کا کن کن پاکستانی ادیب شاعروں سے رابطہ رہا۔

حیدر قریشی: خانپور کے جتنے بھی مقامی دوست تھے، سب سے ہی رابطہ رہا۔ سارے شروع میں بڑے خوش ہوئے اور پھر اس کے بعد ساروں کو ایسا لگا کہ شاید ہماری وجہ سے یہ آگے بڑھ رہا ہے جو اکثر ہوتا ہے اور جب میں نے خانپور چھوڑ دیا اس کے بعد سارے ٹھنڈے ہو گئے۔ اب اتنے سال گذر گئے ان میں سے کسی کو بھی کوئی بے چینی نہیں ہے۔ اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے

عارف فرہاد : جدید ادب کا سلسلہ پھر کب منقطع ہوا اور کب دوبارہ آپ نے اس کا اجراء کیا۔ اس کی بھی ذرا سی تفصیل بتا دیجئے۔

حیدر قریشی: میرا خیال ہے 1987ء میں اس کا آخری پرچہ میں نے پاکستان سے شائع کیا تھا جو سات ادیبوں کا گوشہ تھا۔ ایک جوگندر پال نمبر بھی چھاپا تھا ایک سات ادیب نمبر۔ یہ غالباً 87ء میں ہی آخری شمارہ تھا۔ اس کے بعد پھر خانپور میں جو میرے حالات تھے وہ ایسے نہ رہے کہ میں جدید ادب جاری رکھ سکتا۔ اصل میں اپنی بیوی کے زیور کے بل پر میں نے یہ رسالہ جاری رکھا ہوا تھا، جب وہ زیور بالکل ختم ہو گیا تو رسالہ بالکل بند ہو گیا۔ پھر اس دوران مجھے خانپور بھی چھوڑنا پڑا اور گوجرانوالہ سے لے کر ایبٹ آباد تک کئی مقامات سے گذرتا ہوا میں جرمنی آ گیا۔ جب جرمنی پہنچا ہوں تو یہاں آنے کے بعد خواہش تھی کہ پرچہ نکالا جائے۔ شروع میں جب اس کے دو شمارے نکالے تو میں نے دیکھا کہ ان میں میری اپنی بطور ایڈیٹر Involvement نہیں ہے اور جو مقامی دوست جن کے سپرد وہ کام کیا تھا ان کا اپنا دخل اس میں زیادہ آ گیا ہے۔ میرے نزدیک پرچے کا تشخص شروع سے جو رہا ہے کہ اس میں ایڈیٹر نظر آئے وہ ان دونوں پرچوں میں نہیں تھا۔ لہذا پھر میں نے بند کر دیا۔ اب انٹرنیٹ کی جو سہولت میسر آ گئی ہے اس سے رابطے سیدھے ہو گئے ہیں اور مجھے اس سے کچھ فیضیاب ہونے کا موقع بھی ملا ہے، تین شمارے اب تک نکال چکا ہوں۔ انشاءاللہ چوتھا شمارہ آخری مرحلے میں ہے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب آپ نے افسانے بھی لکھے۔ معاصرین افسانہ نگاروں پر آپ کی نظر بھی رہی۔ آپ کے نزدیک اردو افسانے نے کوئی ترقی بھی کی اور اس میں کوئی پیشرفت بھی ہوئی اور کس حوالے سے ہوئی۔

حیدر قریشی: جدید افسانے کے حوالے سے اردو میں بہت ترقی ہوئی۔ جدید افسانہ، حقیقتاً اردو کا

افسانہ،مغرب کے افسانوں سے بھی نسبتاً بہتر لکھا جار ہا ہے۔

عارف فرہاد : آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے کی روایت ڈالی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انہوں نے انشائیے کو اردو ادب میں متعارف کروایا۔آپ نے خود بھی انشائیے لکھے۔ یہ بتائیے کہ نئے لکھنے والوں کے لئے اگر وہ انشائیہ لکھنا چاہتا ہے تو اس کی تفہیم کیلئے آپ انشائیہ کی کیا تعریف بیان کریں گے کہ انشائیہ ہے کیا؟

حیدر قریشی :اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید کیا کہا جائے کیونکہ کوئی گائیڈ لائن دینے والی بات تو نہیں ہے۔Basically تو یہ ہے کہ ایک موضوع آپ کے ذہن میں آتا ہے تو اس کے مختلف پہلوؤں کو آپ اس زاویئے سے دیکھیں کہ اس کے مخصوص مدار سے آپ باہر نکلیں، پھر دیکھئے، آپ پر کیا کیا نئی چیزیں منکشف ہوتی ہیں۔ٹوپی ہے، کرسی یا گری پڑی چیزیں ہیں جن کو بڑے دانشور اہمیت ہی نہیں دیتے کہ اس پر کیا لکھنا ہے۔انشائیہ نگار کا کمال یہ ہے کہ اس طرح کی عام سی چیزوں کی غیر معمولی خوبیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں اور پھر وہ ان کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

عارف فرہاد : حیدر قریشی صاحب ہم چاہیں گے کہ کچھ آپ اپنی زبانی ماہیے پر اب تک ہونے والے کام کی تفصیل ہمارے قارئین کو بتائیے۔

حیدر قریشی : ماہیے پر کام تو بہت ہوا ہے اور زبانی انٹرویوز میں اتنا سارا حساب بیان کرنا تو بہت مشکل ہے مگر جو مین کام ہے اس میں کوئی 40 سے اوپر تو ماہیے کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور تنقیدی حوالے سے تین کتابیں تو میری آچکی ہیں۔ایک آپ کی جو میں سمجھتا ہوں کہ ماہیے کی ساری بحث کا احاطہ کرتی ہے۔یعنی 1990ء سے لے کر اب تک پوری بحث کا خلاصہ اور احاطہ کرتی ہے۔''ماہیے کے خدوخال'' اس کے علاوہ کچھ اکا دکا کتابوں میں ماہیے کے لئے کچھ سیکشن آئے ہیں مثلاً عروض کی ایک کتاب چھپی ہے اب مجھے نام بھول رہا ہے، شاید ڈاکٹر عارف حسن ہیں یا کوئی اور دوست ہیں۔اس میں انہوں نے باقاعدہ ایک چیپٹر رکھا ہے، ماہیے کی عروض پر اس طرح کچھ اور بھی کتابیں آئی ہیں جن میں ماہیے پر قابل قدر چیزیں ہیں پھر ہندوستان سے ایک صاحب ہیں غالباً مشتاق اعظمی نام ہے ان کا۔ انہوں نے ماہیے پر PHD کی اور انہیں PHD کی ڈگری مل چکی ہے۔وہ مقالہ میں نے نہیں دیکھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا معیار کس لیول کا ہے اور وہاں کے لوگ ماہیے کو جس حد تک سمجھ سکے ہیں اس حد تک ہی انہوں نے بیان کیا ہوگا لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ابھی ایک بچی شگفتہ الطاف PHD کرنے جارہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ PHD کے حوالے سے ان کا مقالہ زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا کیونکہ یہاں کے سارے لوگ جو ہیں وہ ماہیے سے Related ہیں اور

ماہیے کو سمجھنے والے لوگ زیادہ بہتر سمجھنے والے لوگ ہیں۔

عارف فرہاد : تخلیقی اعتبار سے آپ کے نزدیک اہم ماہیا نگار کون کون سے ہیں۔

حیدر قریشی : چونکہ یہ بالکل ابتدائی دور ہے، ماہیے کا تو میرے نزدیک ہر ماہیا نگار ہی میرے نزدیک اہم ہے۔یہاں تک کہ جس نے دو چار ماہیے بھی کہہ دیئے ہیں تو میں اسے بھی اہم سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی جن کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ماہیے کو آگے بڑھنے کا موقع مل رہا ہے تو ابتدائی دور میں ہمت رائے شرما ہیں۔قمر جلال آبادی ہوگئے، ساحر لدھیانوی ہوگئے اور قتیل شفائی اور اس موجودہ دور میں جو لکھنے والے ہیں ان میں نذیر فتح پوری ہیں، آپ خود عارف فرہاد ہیں، ترنم ریاض، شاہدہ ناز، ثریا شہاب ہیں گو ثریا نے بہت کم ماہیے کہے ہیں لیکن جتنے کہے ہیں بہت اچھے کہے ہیں۔سعید شباب ہیں، قمر ساحری مرحوم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، ان کا تو ماہیے کا دیوان ہے جو ایک ہسٹری ہے کہ ماہیے کا دیوان ابھی تک کسی نے نہیں لکھا۔حروف تہجی کے لحاظ سے انہوں نے پورا اس کا التزام رکھا ہے۔امین خیال بھی ہیں، بڑے اہم نام ہیں جو میں بھول رہا ہوں، تو یہ بات مشکل ہے، میرے لئے میں معذرت چاہوں گا کہ بڑے پیارے پیارے دوست میں بھول رہا ہوں۔ناصر نظامی صاحب ہیں ان کا اتنا ضخیم ماہیے کا مجموعہ ہے ''یادوں کی بارش'' اور بھی بہت سے ہیں۔

عارف فرہاد :یورپ کی ادبی فضا کیسی ہے اور کیا آپ کے نزدیک یہاں مقیم ادیبوں اور شاعروں میں سے کسی کی اہمیت بنتی ہے، اردو ادب میں۔

حیدر قریشی :اس سوال کو آپ دو حصوں میں بانٹیں، ایک تو یہ کہ یورپ میں جو لکھنے والے ہیں ان میں سارے ہی لکھنے والے وہ ہیں جو پاکستان سے ہی لکھتے ہوئے آئے ہیں اور اسی حوالے سے ان کی شناخت بنتی ہے جو Prominent ادیب ہیں ان کی شناخت اس لئے نہیں کہ وہ یہاں رہتے ہیں اور یورپ میں رہتے ہوئے وہ اچھے شاعر ہیں بلکہ یہ کہ وہ اردو کی مین سٹریم کے اچھے شاعر ہیں، کوٹہ سسٹم کے تحت اچھے شاعر نہیں ہیں۔ان میں آپ ساقی فارقی لے لیں۔اکبر حیدرآبادی لے لیں۔افسانے میں ہرچرن چاولہ، جیتندر بلو، افضل عباس ایک اچھے شاعر ہیں، ناروے میں۔اسی طرح اور بھی کچھ نام ہیں۔تو یہ وہ لوگ ہیں جو Genuine لکھنے والے ہیں۔اوریجنل لکھنے والے ہیں اور پاکستان سے ہی ان کی شناخت تھی، یہ تو ہوا سوال کا ایک حوالہ، دوسرا حوالہ یہ بنتا ہے کہ یہاں یورپ میں رہتے ہوئے یہاں کی نئی نسل میں سے کوئی بھی شاعر اور ادیب اردو کا نہیں بنا ہے جو کہ ایک المیہ ہے ہمارے لئے۔اور اس سے ہمیں یہ اندازہ کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے کہ یہاں رہتے ہوئے اردو کے فروغ کی صورت نہیں ہے۔سوائے اس کے کہ ہم میلے ٹھیلے کی فضا بنالیں، رونق میلہ لگالیں، ثقافتی شو کرلیں، وہاں تک ٹھیک ہے لیکن ادبی

حوالے سے میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کوئی ایسا قابل ذکر کام ہے۔

عارف فرہاد :ایک جگہ میں نے پڑھا کہ پروفیسر چشتی نے علامہ اقبال کی ایک کوشش دی تھی کہ ہمیں چاہئے کہ ہم ادب اور علم کو مسلمان کریں تو اس پس منظر میں آپ کیا جانتے ہیں کہ کیا ادب اور مذہب کا ایک دوسرے پر انحصار ہے اور کس حد تک ہے۔

حیدر قریشی : مسلمان کرنے والی بات کا تو مجھے علم نہیں ہے چونکہ میرے علم میں نہیں اس لئے میں اس حوالے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ اپنے اپنے Concept کی بات ہے ایک Concept یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کرنے کی بھی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر دیکھا جائے تو لیکن وہ ایک دوسرا Topic ہو جاتا ہے جو مذہب اور ادب کے تعلق کا سوال ہے تو بالکل تعلق ہے اور صرف مذہب اور ادب ہی نہیں، سائنس کو بھی اس میں شامل کر لیں۔ سائنس، مذہب اور ادب ان تینوں کی جستجو کا رخ خالق کائنات کی طرف ہے۔ رستے الگ الگ ہیں تینوں کے۔ مذہب، روحانیت کے حوالے سے خدا کی جستجو کرتا ہے۔ سائنس عقل کے حوالے سے اپنے ٹھوس حقائق کی بنیاد پر۔ لیکن سفر اُسی کی طرف کر رہی ہے۔ اُس کا انکار کرتے ہوئے جا اُسی کی طرف رہی ہے۔ اور ادب جمالیاتی حوالے سے اُسی کی طرف جا رہا ہے لہٰذا ان تینوں کی جستجو کا رخ ایک ہی طرف ہے۔ چونکہ رخ ایک ہے اس لئے تینوں ایک دوسرے سے تعلق تو رکھتے ہیں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب، آپ نے سوئے حجاز، سفرنامہ بھی لکھا، عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ حجاز کی مقدس زمین سے ہو کر آئے، جیسا کہ ابھی ہم اس حوالے سے بات کر رہے تھے کہ سائنس، مذہب اور ادب کا آپس میں تعلق ہے اور ان کا رخ اپنے خالق کی طرف ہے تو آپ وہاں سے ہو کر آئے۔ کیا اس سعادت سے فیض یاب ہونے کے بعد آپ کے ادب یا آپ کے فکری زاویئے میں بھی کوئی تبدیلی آئی۔

حیدر قریشی : میرا خیال ہے کہ کچھ تبدیلی آئی ہے اور وہ میرے سفر نامہ میں خاص طور پر دیکھی جا سکتی ہے اور اس کے پیش لفظ میں میں نے لکھا بھی ہے کہ اس سفر کے دوران کہیں میرے خیالات میں مزید پختگی آئی ہے اور کہیں بہتر تبدیلی آئی ہے۔ لیکن یہ کہ ان کو Sort Out کرنا اور ان کی چھان پھٹک کر کے کچھ کہنا تو بڑا مشکل ہے کہ خاص طور پر کوئی بات Point Out کی جائے۔ یہ کام میرا خیال ہے نقاد کا ہونا چاہئے وہ دیکھے کہ بھئی اس سفر کے بعد اس کے ہاں کیا تبدیلی آئی ہے۔

عارف فرہاد : ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر اب تک کچھ دوست پاکستان سے حکومت کی طرف سے آئے۔ آپ کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اس چیئر پر آ کے اردو کے لئے کوئی کام کیا یا محض

حاضریاں لگا کر جاتے رہے۔

حیدر قریشی : اس شعبے کی کارکردگی کا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میرا رابطہ صرف ڈاکٹر کرسٹینا تک رہا۔ وہ بھی جس حد تک ہمارا کام ہوتا تھا کبھی کوئی وہاں فنکشن کیا تو اس کے لئے کچھ کر دیا یا جدید ادب کے ایک دور میں وہ ساتھ رہیں۔ بس اس حد تک ہمارا رابطہ رہا۔ اقبال چیئر کے تو کسی دوست سے ملاقات ہی نہیں ہوئی یہاں تک کہ اپنے پروفیسر فتح محمد ملک صاحب سے بھی ماریشس میں ملاقات ہوئی۔ یہاں جرمنی میں رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوئی۔

عارف فرہاد :اب ذرا نثری نظم کی طرف آتے ہیں کہ کیا آپ اسے شاعری سمجھتے ہیں۔

حیدر قریشی :اصل میں یہ بحث اتنی ہو چکی ہے کہ اب اس پر کیا کہا جائے۔

عارف فرہاد : آپ کا اپنا View کیا ہے؟

حیدر قریشی : میرا View یہی ہے کہ نثری نظم میں شعری مواد ہوتا ہے لیکن یہ شاعری نہیں ہوتی۔

عارف فرہاد :یعنی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی Diction Poetic ہے

حیدر قریشی : نہیں میں اس کو مزید واضح کر دیتا ہوں، پہلے بھی اس کی ایک مثال دی تھی، اب میں مزید واضح کر دیتا ہوں۔ تاج محل میں جتنا میٹیریل صرف ہوا ہے اس سارے کا اگر ڈھیر لگا دیا جائے تو وہ شعری مواد ہے۔ یہ سارا میٹیریل ہے اس میں یہ چیز استعمال ہوئی اس میں وہ چیز استعمال ہوئی ہے، یہ سنگ مرمر ہے، یہ گارا ہے، یہ مٹی ہے، یہ ساری چیزیں جو ہیں ان کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ الگ الگ ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں اور یہ شعری مواد ہے۔ جب اس مواد کو فنکارانہ طور پر استعمال کرتے ہوئے آپ نے تاج محل تعمیر کر دیا تو وہ ایک شاندار نظم بن گئی ہے تو نثری نظم شعری مواد ہے صرف میٹیریل کا ایک ڈھیر ہے۔ شاعری نہیں ہے۔

عارف فرہاد :یعنی ضرورت ہے کہ اسے شاعری میں تبدیل کیا جائے۔

حیدر قریشی : مطلب وہ ان کی مرضی ہے، وہ چاہیں تو ویسے ہی رہنے دیں۔۔۔

عارف فرہاد : بہت خوب! یہ بتائیے کہ اگر ہم ہندوستانی اور پاکستانی شعری ادب کا موازنہ کریں تو آپ کو کس کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے۔

حیدر قریشی : میرا خیال ہے پلڑا بھاری والی بات نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں اس پر زیادہ کام ہوا ہے۔ تھوڑا سا پاکستان کا پلڑا بھاری لگتا ہے لیکن اٹھارہ، بیس کا فرق ہے، کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، آپ اٹھارہ ہندوستان کو نمبر دے دیں اگر تو 20 پاکستان کو دے دیں۔

عارف فرہاد:یعنی برابر ہے

حیدر قریشی : جی ہاں

عارف فرہاد : آپ کی اپنی تصنیفات اور جو آپ کی مرتب کردہ کتب ہیں ان کی تفصیل بتائیے۔

حیدر قریشی : بھائی اب زبانی تو میں یہ نہیں بتا سکتا، شاعری کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں اور چاروں کی کلیات چھپ چکی ہیں۔ اب پانچویں مجموعے سمیت کلیات کا دوسرا ایڈیشن آ رہا ہے۔ اسی طرح افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں اور ابھی چند دن پہلے ڈاکٹر رشید امجد بات کر رہے تھے تو کہنے لگے کہ بھئی تم تو اصل بندے ہی افسانے کے ہو۔ تم افسانہ لکھو اور جو افسانہ لکھو مجھے بھیجو۔ میں اس کا مطالعہ کر کے اس پر آرٹیکل لکھوں گا۔ دراصل وہ مجھے ایک طرح سے تحریک دینا چاہتے تھے کہ میں افسانے کی طرف مزید سنجیدگی اختیار کروں۔

عارف فرہاد : کیونکہ وہ خود افسانہ لکھتے ہیں۔

حیدر قریشی : ہاں یہ بہت کم ہوتا ہے، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو افسانہ نگار ہوتا ہے وہ آپ کی شاعری کی تعریف کرتا ہے اور جو شاعر ہوتا ہے وہ آپ کے افسانوں کی تعریف کرتا ہے۔ وہ افسانہ نگار ہیں اور وہ میرے افسانوں کی ہی تعریف کر رہے تھے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب ! آپ اس وقت Internet پر بیٹھے ہیں اور بہت سی اردو ویب سائیٹس پر کام بھی کر رہے ہیں۔ آپ کی تخلیقات بھی ہم Net پر دیکھتے رہتے ہیں۔ ''اردو رائٹرز فورم'' بھی ہے۔ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے ہماری نئی نسل کتاب سے دور ہو گئی ہے، کیا اسے کتاب کی طرف لانے کیلئے کوئی حکمت استعمال کی جا سکتی ہے۔

حیدر قریشی : جو انٹرنیٹ پر اردو کی ویب سائیٹس کا مسئلہ ہے ان کی وجہ سے تو لوگ کتاب سے دور نہیں ہو رہے، کچھ اور مسائل کی وجہ سے کتاب سے ضرور دور ہوئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر تو میں سمجھتا ہوں اردو کا آنا، اردو کتابوں کا آنا، اردو ادب کا آنا بڑا بابرکت اور بڑا مفید ہے اور اچھا ہے اس سے اردو کے مستقبل پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا لیکن اردو کتاب واقعی زد میں آئی ہوئی ہے۔ وہ کس چیز کی زد میں آئی ہوئی ہے۔ یہ جو نئے چینل آ رہے ہیں اور دلچسپی کے نئے جو سامان آ رہے ہیں اس کے نتیجے میں لوگ ادب سے بالکل الگ تھلگ ہوئے جا رہے ہیں اور یہاں تک کہ آپ کو نئے چینلز پہ کہیں کوئی سنجیدہ ادبی پروگرام آدھے گھنٹے کا بھی دکھائی نہیں دے گا اور اگر کہیں کوئی غیر سنجیدہ سے پروگرام بھی ہوں گے تو ان میں بھی تمسخرانہ انداز زیادہ ہوگا، ادب کے تعلق سے۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب ! ادب تو ایک طرف، میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ بیرون ملک پاکستانیوں کی جو نئی نسل ہے وہ اردو زبان سے بھی بہت دور ہو کر رہ گئی ہے۔ ان میں اردو کا رجحان کیسے پیدا

کیا جائے۔

حیدر قریشی : دیکھیں جی کچھ لوگ رضا کارانہ طور پر ذاتی حیثیت سے کچھ نہ کچھ جدوجہد کر رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں ان کی Struggle اپنی جگہ مخلصانہ ہے لیکن اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ کلچرز کا ٹکراؤ یا ملاپ ہے اس میں ظاہر ہے اردو کہاں Survive کر سکتی ہے۔ یہ تو بس ہم جیسے مہاجرین جو آتے رہیں گے، تازہ تازہ آئیں گے۔ ان کی وجہ سے اردو کا رونق میلہ رہے گا جو نئی نسل آئے گی ان کے لئے اردو زیادہ سے زیادہ ایک بولنے والی زبان کی حد تک رہ جائے گی تو وہ بھی ایک نسل تک۔ دو نسل تک، مطلب پڑھنے اور لکھنے والی اردو نہیں رہے گی۔

عارف فرہاد : آپ کو شعر و ادب میں آئے ہوئے تقریباً 33 سال ہو چکے ہیں، اگر آپ اپنی نگارشات پر نظر ڈالیں تو آپ کو کس صنف میں آپ کا اپنا کام مطمئن کرتا نظر آتا ہے۔

حیدر قریشی : کسی ایک کی میں تخصیص نہیں کر سکوں گا۔ شاعری پہلی محبت ضروری ہے، میرا خیال ہے وہی بات جو شروع میں دو بزرگوں کے بارے میں کہی گئی تھی۔ مجموعی طور پر مجھے اپنے پورے کام کے بارے میں ایک سطح پر اس حد تک اطمینان ہے کہ جو کچھ میرے دامن میں تھا اسے جس حد تک ممکن تھا ادبی سلیقے سے پیش کر دیا ہے لیکن ایسا اطمینان نہیں ہے کہ بس میں نے جو کچھ پیش کرنا تھا پیش کر دیا۔ کیونکہ ایسا اطمینان کبھی نہیں ہونا چاہئے اور خوب سے خوب تر کی تلاش رہنی چاہئے اور وہ نہ رہی تو پھر تو آپ نے لکھنا چھوڑ دیا۔

عارف فرہاد : یعنی آپ دوسرے الفاظ میں اسے ادب کا آل راؤنڈر کہہ سکتے ہیں۔

حیدر قریشی : نہیں مجھے یہ لفظ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی بجائے اگر آپ زمیندارے والے حساب سے کہیں کہ ایک زمین ہے جو صرف ایک ہی فصل اگاتی ہے اور ایک زمین ہے جس میں سال میں دو تین فصلیں اگائی جا سکتی ہیں۔ ایک سے زیادہ فصلیں اگائی جا سکتی ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بھی تو ہے کہ ایک ہی زمین میں کئی فصلوں کے بیج بو دیئے جائیں اور بیک وقت وہ سارے ہی Grow کر جائیں۔

حیدر قریشی : یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ زمین اتنی زرخیز ہوتی کہ وہ ساری فصلوں کی نشوونما کرتی ہے۔

عارف فرہاد : پاکستان یاد نہیں آتا، کیا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا؟

حیدر قریشی : یہ جو میں بار بار شروع سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے ماضی سے وابستگی، اپنی مقامیت سے وابستگی اور اپنی جڑوں سے وابستگی، تو یہ پاکستان واپس جانے کی ہی بات ہو رہی ہے۔ یعنی اپنے گھر کا یاد

آنا، گلیوں کا یاد آنا، Even وہ جو گھر کی گلی میں ہوائی چپل پہنے ہوتے اور کوئی پتھر پاؤں سے ٹکرا جاتا اور انگوٹھا زخمی ہو جاتا، مجھے تو اب وہ پتھر بھی یاد آتا ہے۔ اس پتھر پہ پیار آتا ہے جس نے زخمی کر دیا تھا۔

عارف فرہاد : اصل میں یہ سوال آپ سے اس لئے کیا گیا ہے کہ پاکستان میں مقیم ہمارے اکثر دوست یہ کہتے ہیں کہ یورپ جا کر لوگ پاکستان کو بھول جاتے ہیں تو میں چاہتا تھا کہ ایک عام آدمی کی رائے کے ساتھ ساتھ ایک ادیب کی رائے بھی جان لی جائے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ جرمنی میں آ کر مجھے کوئی سنجیدہ ادیب آپ کے علاوہ نظر نہیں آیا بلکہ یوں کہیے کہ اگر شاعر ملا تو وہ وزن میں لکھنے والا نہیں ملا اس کی کیا وجہ ہے۔

حیدر قریشی : (ہنس کر) میں کیا کہہ سکتا ہوں بھئی، میں نے اس کی وجوہات پہلے بڑی وضاحت سے بیان کی تھیں اور بڑی گالیاں کھائی تھیں تو اگر آپ مجھے مزید گالیاں دلوانا چاہتے ہیں تو میں وجہ پھر کھول کر بتا دیتا ہوں۔

عارف فرہاد : جی ہم جاننا چاہیں گے۔

حیدر قریشی : بات یہ ہے کہ جو لوگ یہاں 20، 25 سال سے آئے ہوئے ہیں، جوانی انہوں نے بھرپور گذار لی۔ مڈل ایج Crises میں آئے اب۔ یہاں Well Establish ہو گئے۔ روٹی، روزی کی فکر نہ رہی۔ بچوں کے معاملات میں بھی ایک حد تک آزاد ہو گئے تو اب انہیں یہ خیال آیا کہ نام کمانا چاہئے کسی طرح۔ پرانے زمانے میں لوگ پُل بنواتے تھے۔ کنواں بنواتے تھے۔ مدرسے بنواتے تھے۔ نام کمانے کیلئے یا ثواب کمانے کے لئے۔ اب ثواب کہیں پیچھے چلا گیا ہے اور نام کمانے کی یہ صورت رہ گئی ہے کہ شاعر بن جاؤ۔ اس میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ سادہ سے لوگ ہیں جو جیسی بھی بے وزن شاعری کرتے ہیں ایسے ہی اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں اور اس پر ہی فخر کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو نسبتاً سیانے ہیں اور وہ پلے سے پیسہ خرچ کر کے کتابیں لکھواتے ہیں اور چھپواتے ہیں۔ تو شاعر تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے جو میرے ایریئے میں ہیں اور مجھ سے ملے ہوئے لوگوں میں سے جو صاحبِ کتاب بنے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی شاعر نہیں ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ ساری کرپشن پھیلانے میں ہمارے ہندوستان اور پاکستان کے بعض اساتذہ Type شعراء جو ہیں وہ برابر کے مجرم ہیں۔

عارف فرہاد : یہ بات واقعی افسوسناک ہے، خدا کرے کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے اور دو نمبر لکھنے والوں کی وجہ سے یہ جو گرد و غبار بیچ میں پیدا ہو جاتا ہے نہ رہے تا کہ ہمارا منظر نامہ اور جینئن لکھنے والوں کی پہچان کرا سکے۔ قریشی صاحب! آپ نے یورپ میں بھی زندگی بسر کی، مشرق میں بھی۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ برائیاں بیان کریں، میں یہ چاہوں گا کہ آپ نے اپنی تہذیب، مشرقی تہذیب کی جو اچھائیاں محسوس

کیں اور یورپ کی جو روایات یا یہاں کی تہذیب میں جو باتیں اچھی لگیں وہ ذرا مختصر بتا دیجئے۔

حیدر قریشی : اگر آپ اجازت دیں تو جو پہلا سوال تھا اس میں تھوڑی سی بات رہ گئی تھی، پہلے میں اس کو بیان کر دوں۔ بات صرف جرمنی میں ہی مقیم شاعروں کی نہیں ہے مجھے لندن میں ملینیم کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اب آپ بتائیں کہ ایک ملینیم کانفرنس ہے جو دو ملینیم کے ایک نکتہ اتصال پر ہو رہی ہے جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے جید اردو سکالرز بھی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہاں پر مشاعرہ ہوتا ہے۔ آپ یقین کریں میں نے تب لکھا تھا کہ ون تھرڈ شاعر بے وزن پڑھ رہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آدھے شاعر بے وزن اشعار پڑھ رہے تھے اور داد پا رہے تھے۔ میرا تو اس طرح کی کانفرنسوں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ اب آپ کے اگلے سوال کی طرف آتے ہیں تو خوبیاں اور خامیاں جناب یہ۔

عارف فرہاد : خامیاں نہیں......خوبیاں گنوا دیں آپ۔

حیدر قریشی : اچھا......خوبیاں، تو خوبیاں یہ کہ جو مغرب کے لوگ ہیں یہ اپنے ملک سے اپنی قوم سے انتہائی وفادار ہیں اور جن باتوں کو ہم اپنی خوبیاں گنواتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا، جھوٹی گواہی نہیں دینی اور بے ایمانی یا ہیرا پھیری نہیں کرنی، مجموعی طور پر یہاں کا معاشرہ ان ساری خوبیوں سے مالا مال ہے اور جو برائیاں ہماری نظر میں برائیاں ہیں، آپ برائیوں کی طرف نہیں آنا چاہ رہے لیکن میں اس کو پھر بھی بیان کروں گا کہ جو برائیاں ہماری نظر میں برائیاں ہیں (جنسی آزادی وغیرہ) وہ حقیقتاً ان کو برائی سمجھتے ہی نہیں ہیں اور وہ ان کے معاشرے کا حصہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ جو چیزیں ہمارے ہاں صرف طبقہ اشرافیہ کیلئے مخصوص ہیں وہ یہاں انہوں نے عوام کیلئے بھی عام کر دی ہوئی ہیں کہ اگر اشرافیہ ان کو Enjoy کر سکتا ہے تو عام آدمی بھی Enjoy کر سکتا ہے۔ بس زور زبردستی اس میں کہیں نہیں ہے اور یہی عمل ہمارے ہاں ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ باقی رہ گئی ہمارے مشرق کی خوبیاں تو مشرق کی خوبیاں بہت سی ہیں۔ خاص طور پر ہماری روایات میں جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ رشتوں کا جڑا رہنا ہے۔ اس نے ہم سب کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ تو یہ ایک ایسی خوبی ہے جس میں باقی چھوٹی چھوٹی برائیاں اور بہت سے عیب چھپ جاتے ہیں مگر یہاں پر یہ صورتحال نہیں ہے کیونکہ فیملی سسٹم ٹوٹا ہوا ہے۔

عارف فرہاد : عرب کا مشہور قولہ ہے السفر وسیلہ ظفر۔ پاکستان سے جرمنی کے سفر میں آپ کو بھی کوئی کامیابی ملی۔

حیدر قریشی : دیکھیں ایک کامیابی تو سیدھی سی ہے نا کہ جو اقتصادی لحاظ سے مسائل تھے وہ سارے ختم ہو گئے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے 80 ہزار روپے کا مقروض تھا اور وہ میرے لئے اتنا بڑا قرضہ

تھا جتنا غالب کیلئے اپنے زمانے کا قرضہ تھا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ تھا میرے لئے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ میں اسے کیسے اتار سکتا ہوں۔ وہ سارا قرضہ نہ صرف یہ کہ پہلے سال میں ہی اتر گیا بلکہ Relax بھی ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقتصادی لحاظ سے یہ جو آسودگی ہے یہ بہت ضروری ہوتی ہے اور اس کے بعد تخلیق کار کے کام شروع ہوتے ہیں۔

عارف فرہاد : قریشی صاحب! مجھے یورپ میں تو اردو کا کوئی مستقبل نظر نہیں آیا اور یہ ہماری بدقسمتی بھی ہے لیکن یہ بتائیے کہ کیا جیسے یہاں اردو ادب کا مستقبل نظر نہیں آ رہا کیا یہاں مقیم پاکستانیوں کا بھی یہی حال ہے یا اس کے برعکس ہے۔

حیدر قریشی : کن معنوں میں؟

عارف فرہاد : دیکھئے میرا سوال یہ ہے کہ مجھے اردو کا تو یہاں روشن مستقبل نظر نہیں آ رہا، جیسا کہ آپ نے بھی ابھی بتایا کہ ہماری نئی نسل اردو سے دور ہو گئی ہے یہاں تک کہ ہم خود یہاں آ کر اردو کی بجائے جرمن زبان بولنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں تو کیا پاکستانیوں کا مستقبل بھی اسی طرح سیاہی کی طرف گامزن ہے یا ان کا مستقبل آپ کو روشن ہوتا نظر آ رہا ہے؟

حیدر قریشی : بڑا مشکل سوال ہے یہ مجھے سمجھ اس طرح سے نہیں آ رہی کہ میں اس کو کس طرح سے Explain کروں لیکن یہ ہے کہ جو پاکستانی یہاں آ گئے ہیں وہ Settle ہو گئے ہیں۔ انہیں تو ظاہر ہے اسی معاشرے میں ضم ہونا ہے اور کسی حد تک اپنی شناخت رکھتے ہوئے ہی ضم ہونا ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ بنیاد ہماری یہی ہے لیکن اب ہم اس معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں گو کہ اس معاشرے میں ضم ہوتے ہوئے ابھی ان کو تین یا چار نسلوں کا ٹائم لگے گا لیکن ہونا یہی ہے آخر کار کہ انہوں نے ان میں جذب ہو جانا ہے، اگر آپ کہیں کہ یہ اپنی پوری پاکستانیت کے ساتھ یہاں رہیں گے تو یہ موجودہ نسل تک ہی ممکن ہے اس سے اگلی نسل میں ممکن نہیں ہو گا۔

عارف فرہاد : آپ کا اب تک جو قیام ہے جرمنی میں اس دوران یہاں سے اردو کے اخبارات و جرائد کون کون سے نکلتے رہے؟

حیدر قریشی : ثریا شہاب اور آپ نے ایک نکالا تھا ماہنامہ ''فورم انٹرنیشنل''۔ ہمارے ارشاد ہاشمی کا اردو دنیا بھی نکلتا رہا ہے۔ اس نے بڑے ہنگامے برپا کئے تھے۔ پچھلے دو تین سالوں سے روزنامہ ''اوصاف'' نکل رہا ہے اور بھی دو تین پرچے نکلے تو ہیں لیکن بس so,so سے ہی تھے۔ ٹھیک ہے ایک رونق میلہ ہے کہ لوگوں نے بڑی ہمت کی اور اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لئے یہ محنت کی ہے تو جس نے جتنی بھی محنت کی ہے اس کے حساب سے ٹھیک ہے۔

عارف فرہاد : آپ اپنی کوئی پسندیدہ غزل اور ماہیے ہمارے قارئین کو سنانا پسند کریں گے۔

حیدر قریشی : جی ضرور جناب! ایک غزل ہے چھوٹی سی، اس کے اشعار پیش ہیں۔

وہ جو ابھی تک خاک میں رُلنے والے ہیں   سچے موتیوں میں اب تُلنے والے ہیں
اپنی ذات کے دروازے تک آ پہنچے   بھید ہمارے، ہم پر کھلنے والے ہیں
دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم   سو اب اس کے عشق میں گھلنے والے ہیں
واقفیت ہے ان سے اپنی برسوں کی   دکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں
آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری   حیدر میل دلوں کے دھلنے والے ہیں

عارف فرہاد : کچھ ماہیے بھی سنائیے۔

حیدر قریشی : جی ماہیے بھی سنا دیتا ہوں، یار یہ ویسے تو بڑا آکورڈ سا لگتا ہے لیکن میرا دل کرتا ہے کہ ماہیے کی بحث میں چونکہ ہم نے کہیں اس کے وزن کو Discuss نہیں کیا اور وزن کو Discuss کریں تو اس کی ''لے'' آ جاتی ہے۔ اس لئے ترنم والا شاعر نہ ہونے کے باوجود بھی میں یہ چاہوں گا کہ ماہیے تھوڑی سی لے کے ساتھ پڑھنا چاہوں گا۔

عارف فرہاد : جی ضرور

حیدر قریشی :

☆ تھے اپنی ہی لہروں میں
عمر گزاری جو
پنجاب کے شہروں میں

☆ یادوں کے خزینے میں
خانپور اپنا تو
آباد ہے سینے میں

☆ لفظوں کے مداری ہیں
عشق کے جذبے سے
جو شاعر عاری ہیں

☆ رائن سے چناب ملا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب ملا

عارف فرہاد : بہت بہت شکریہ۔

☆☆

www.haiderqureshi.com

ویب سائٹ پردرج تاثرات سے انتخاب

(حیدر قریشی کی ویب سائٹ کی گیسٹ بک میں منشا یاد، ڈاکٹر حمید سہروردی، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر لڈمیلا، احمد سہیل، سلطان جمیل نسیم، پروفیسر عبدالرب استاد، خالد حمید فاروقی، اور دیگر اہم ادبی شخصیات کے تاثرات بھی درج ہیں۔ان سب کے تاثرات کو پروفیسر نذر خلیق نے اپنی کتاب ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' میں شامل کرلیا تھا۔اس کے بعد جن افراد نے سائٹ کو وزٹ کرتے ہوئے اس کی گیسٹ بک میں اپنے تاثرات درج کیے، ان کا انتخاب ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔**ارشد خالد**)

پروفیسر رحمت یوسف زئی۔حیدرآباد(انڈیا)

It is a fantastic page. My hearty congradulations to Mr Hyder Quraishi. I have read his book on Mahia and have reffered it in my articles/research work by my students

....

منیر ارمان نسیمی۔بھدرک(انڈیا)

I got to visit your site via Sher-o-Sukhan. بہت ہی شاندار اور دیدہ زیب سائٹ ہے۔اللہ کرے آپ اسی طرح اردو کی آبیاری کرتے رہیں۔آمین

....

فہیم احمد فہیم۔لاہور

Your poetry is very beautiful and attractive "Succhay Shaer Kehtay Hein Aap janab". Specialy your Ghazals are so admiring, I am realy very much impressed,

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

....

ڈاکٹر سریندر بھوٹانی۔وارسا(پولینڈ)

It was a pleasant surprise to know the real meaning of Haider Qureshi's personality. He has done very well for Urdu Adab.Lekin" abhi sitaroN se aage jahaN aur bhi." Hope he will do a good service for Urdu literature in future also. His output is amazing.

....

ارواح عمر۔امریکہ

Such a wonderful website. You've done a tremendous job in order to complete this website. I can say that this website is successful because of your great efforts.

....

ڈاکٹر شہزاد وسیم۔راولپنڈی

This is a beautiful website with all its classical colours, Your poetry touches the hearts and provocates not only thinking but also forces others to write. I think let the time should decide!God Bless you

....

میشائیل گرابے (جرمنی)

Lieber Herr Qureshi,

ich bin von Ihrer Seite sehr beeindruckt. Sie hat eine optisch schöne und sehr professionelle Aufmachung. Leider kann ich davon natürlich nichts lesen. Ich möchte mich jedoch auch an dieser Stelle herzlich bedanken, dass wir Ihre Gedichte in unserer kleinen Hauszeitschrift abdrucken dürfen.

Viele Grüße

Michael Graber-Dünow

طارق مقبول (وینکوور۔کینیڈا)

جب زمانے میں سچا خلوص ناپید ہو اور ادبی باتیں روح سے خالی معلوم ہوں، ایسے میں حیدر قریشی صاحب آپ قلمی جہاد کر رہے ہیں۔خدا کرے یہ جوش و جذبہ اور زیادہ۔

....

اسلم بدر (جمشید پور)

''عمرِ گریزاں''اور''دعائے دل'' کی تقریباً تمام غزلیں پڑھ لی ہیں۔اکثر غزلیں متاثر کرتی ہیں۔جرمنی میں رہ کر شعر و ادب کے لیے اتنا کچھ کر جانا ہی حیرت کی بات ہے۔آپ کی غزلیں جدیدیت اور کلاسیکیت کے درمیان سے گزرتی ہوئی کافی خوشگوار نقش چھوڑتی ہیں، اور اس وقت تو اور بھی جب اشعار میں جمالیاتی رنگ جھلکنے لگتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ جمالیات ہی آپ کی پہچان بھی ہے۔آپ کے ماہیے بھی کسی ویب پر دیکھے تھے۔ماہیے بھی آپ نے خوب لکھے ہیں۔

....

عاصمہ خان (امریکہ)

آپ کی ویب سائٹ میں تمام افسانے اور شاعری بہت بہترین اور خوبصورت ہے۔۔۔میں اس کی مستقل ریڈر رہوں۔

....

حسیب الرحمن ملک (مانٹریال۔کینیڈا)

This is a beautiful website with all its classical colours, Your poetry touches the hearts and provocates not only thinking but also forces others to write. I think let the time should decide!

- -

صغیر (فرانس)

i just by chance find out your web site iread your mahiya regarding 5th july itis very nice you did a good job ireally apriciate you

....

زبیر احمد گجر (آسٹریا)

i have seen your web pag it is really wonder full,it is a great work for improv our national language urdu,i really like it.

....

سلمان (بھاولپور)

A good effert to promote Urdu on the web. I offer my services in this context.

....

ارشد حسین (حیدرآباد۔انڈیا)

سوئے حجاز سفرنامہ نظر نواز ہوا۔دل میں زیارتِ کعبہ کی زبردست خواہش پیدا ہوئی ہے۔اچھی سائٹ ہے اور نفیس کلام ہے۔

....

سید یوسف علی (کراچی)

I have no hesitation to admit you had a great job . I was much impressed to know about your work,it is why I watched your web site and read all the matter including your poetry and articles.Please accept my hearty congritulation.It was also my wish to introduce your valued work in Pakistan . SYED YOUSUF ALI

Senior Sub Editor/ Incharge Foriegn Desk,Daily "JURAAT" Karachi

....

کساندرا راؤزن (امریکہ) Cassandra Rouson

I think Haider Qureshi is a wonderful friend he is a man of his word and really admire him. It is a great honor for me to have met him. I offer many blessings to my friend and all that is related to him.

....

غیاث انجم (بکارو۔انڈیا)

آپ کی سائٹ دیکھی،خوشی ہوئی۔آپ کی تمام کتابوں کے نام اور کلام پڑھنے کا نیا انداز اچھا لگا۔

....

رضوانہ کوثر (مائنٹال،جرمنی)

Comments: ich find Ihre webseite herzberuabend. ich bin wirklich stolz auf Ihnen Papa. keep this elegent work and prosper in each field of life.

....

ندیم (ایبٹ آباد)

I was just browsing when i came across this familiar name who had been my teacher and I have learned a lot from this person.Its a very good effort on the part of those who have always strived for the betterment of literature in this part of the world.

....

دانش طاہر (کراچی)

Really this site presents the standard of urdu Literature.Very impressive work.

....

آج سے چند سال پہلے ڈنمارک سے ''شاہین انٹرنیشنل'' کی اشاعت پر میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور مدد کی درخواست کی ،انہوں نے جس ظرف ،وسعت قلب، پیار اور محبت سے اس پراجیکٹ میں میری راہنمائی کی وہ صرف حیدر قریشی کا ہی کام ہوسکتا ہے۔تعلق قربت میں اور قربت دوستی میں بدل گئی۔اسی طرح میں نے اردو کمپیوٹر کوفرینکفرٹ میں حیدر قریشی کے توسط سے متعارف کرانے میں نمایاں رول ادا کیا۔۔۔ ادب کی ہر صنف پر بے پناہ اور بامقصد لکھنے والا ،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی سوتے میں بھی لکھتا ہے۔میری مہمان نوازی کے دوران دن کا پورا وقت مجھے دینے کے باوجود رات کو اپنے ہاتھ سے لکھے بیس خط میرے سامنے رکھ دیئے، جو کہ پاکستان اور انڈیا کے مختلف ادیبوں اور شعراء کے نام تھے۔ (**محمد آصف خواجہ** کے تاثرات،

بحوالہ کتاب **انٹرویوز** مرتب **سعید شباب** ص ۱۴۵،۱۴۶)

ناصر نظامی (ہالینڈ)

حیدر قریشی کے لئے دلی جذبات

خوش فکر ہیں، خوش قسمت و خود دار ہیں حیدر
پُردرد ہیں، ہمدرد ہیں، پُرکار ہیں حیدر
وہ تو ہیں نئی جہتوں، نئی پرتوں کے خوگر
تجدید کے مکتب کے قلم کار ہیں حیدر
ہر پل وہ لٹاتے ہیں نئی فکر کے موتی
گل خیز و سمن ریز و گہربار ہیں حیدر
تخلیق ہو، تحقیق ہو، تنقید ہو، کچھ ہو
اردو کے اہم شاعر و نثّار ہیں حیدر
ماہیے کو عطا کی ہے نئی شان ادب میں
سب کج روؤں سے برسرِ پیکار ہیں حیدر
ہستی ہیں وہ احساس کی کرنوں کی دھنک سی
بے لوث ہیں، دَم ساز ہیں، غم خوار ہیں حیدر
مُرجھائی ہوئی رُوحوں میں جو بھر دے نیا دَم
اس نگہتِ اخلاص کی مہکار ہیں حیدر
وہ فنِ ظرافت کی ادا سے بھی ہیں واقف
جب بات کو کردیتے گرہ دار ہیں حیدر
ناصرؔ نے تہہ دل سے لکھا اُن کا قصیدہ
تعریف کے، توصیف کے حق دار ہیں حیدر

ڈاکٹر صابر آفاقی (مظفر آباد)

غزل
پیارے حیدر قریشی کے نام

مصرعہ تمہارے شعر کا یہ کام کر گیا
نشتر کی طرح میرے جگر میں اُتر گیا

وہ شخص دل کے شہر میں اب بھی مقیم ہے
وہ شخص گرچہ دیس سے پرواز کر گیا

کچھ بھی ہو بزمِ ناز سے جانا نہیں کہیں
نکلا جو ایک بار تو وہ عمر بھر گیا

دل میں ہزار خنجر و نشتر چمکتے ہیں
جب پوچھتے ہیں آپ کا حیدرؔ کدھر گیا

تُو جرمنی میں شاد رہے اے مِرے عزیز!
مجھ کو خوشی ہے تیرا مقدّر سنور گیا

صابرؔ کبھی بھی شہرِ وفا کو نہ چھوڑنا
پھر کیا رہے گا شہر میں، تُو بھی اگر گیا

(ڈاکٹر آفاقی صاحب نے یہ غزل اندازاً ١٩٩٥ء میں کہی تھی، یہ گلبن احمد آباد میں چھپ چکی ہے)

اطہر راز (لندن)

فکروفن کے رازداں حیدر قریشی آپ ہیں
الجھنوں کے درمیاں حیدر قریشی آپ ہیں

بدگمانی کی فضا میں حق نظر آتا نہیں
حق پرستی کا نشاں حیدر قریشی آپ ہیں

آپ کے دَم سے منوّر ہیں محبت کے چراغ
روشنی کا آستاں حیدر قریشی آپ ہیں

سوءِ ظن کی راہ میں تخریب کی اُڑتی ہے دھول
حسنِ ظن کے ترجماں حیدر قریشی آپ ہیں

آپ کا قد بھی نمایاں ہے ادب کے شہر میں
رازؔ میرے ہم زباں حیدر قریشی آپ ہیں

نوٹ: یہ اشعار اطہر راز مرحوم نے تب کہے تھے جب لندن کے اردو ادبی مافیا نے حیدر قریشی کے خلاف غلیظ مہم شروع کر رکھی تھی۔ یہ اشعار لندن کے رسالہ ''پرواز'' میں چھپ چکے ہیں۔(**ارشد خالد**)

اسلم حنیف (گنور، بدایوں)

توشیح
حیدر قریشی کے نام

ح — حریری جذبات واحساسات کے اظہار پر
ے — یدِطولیٰ رکھنے والی ادبی ہستیاں
فعال اور متحرک ہستیاں
د — دورافتادہ، مفلوج کن ماحول اور
مصروف زندگی میں بھی
ر — ریاضتِ فن سے غافل نہیں ہوتیں
مشغلۂ لوح وقلم کے وقت
ق — قطبین وآفاق اور زندگی کے حقائق
ان کی نوکِ قلم پر مجتمع ہوجاتے ہیں
ر — رواں دواں قلم جب ان کو مختلف علامتوں میں
ترسیل، کی قوتوں سے ہمکنار کرتا ہے تبھی
ے — یعنی تبھی
ش — شہرۂ آفاق تصانیف معرضِ اظہار میں آتی ہیں
ی — یقیناً حیدر قریشی تم بھی اسی قبیل کے فنکار ہو
تم نے خود کو قلم کے حوالے کر کے
ادب پر احسانِ عظیم کیا ہے

قطعہ — عاصی کاشمیری (برمنگھم)

کتنا عالی مقام ہے حیدرؔ
ماہیے کا امام ہے حیدر
نظم، تنقید ہو کہ افسانہ
مستند ایک نام ہے حیدر